مولا کی نگری

م۔ م۔ راجندر

یہ کتاب

فخر الدین علی احمد میموریل کمیٹی، حکومت اُتر پردیش لکھنؤ
کے جزوی مالی تعاون سے شائع ہوئی۔

مولا کی نگری

(نئے افسانوں کا انتخاب)

م۔م۔راجندر

تقسیم کار
موڈرن پبلشنگ ہاؤس
۹، گولا مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی۔۱۱۰۰۰۲

اشاعت	:	اکتوبر 2002
تعداداشاعت	:	چارسو
قیمت	:	ایک سوپچھتّر روپے۔
کمپیوٹر کمپوزنگ	:	مُجاہد کمپیوٹرس، نئی دہلی-۲۵، 6326298 ☎
سرورق	:	وجے گرافکس، نئی دہلی۔
مطبع	:	ایچ ایس آفسیٹ پریس، نئی دہلی۔
ناشر	:	م-م-راجندر

ISBN 81-8042-018-3

MAULA KI NAGRI (SHORT STORIES)
By : M.M.RAJINDER

Price Rs.175/- October 2002

ترتیب

م۔م۔ راجندر

۱۔ م۔م۔راجندر نے اپنے افسانوں میں انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں کی عکاسی کی ہے اور بڑی عمدگی سے۔ افسانے کے بارے میں ان کی اعلیٰ سوجھ بوجھ نے ان کے افسانوں میں تعمیری پہلو کو بھی داخل کر دیا ہے جو زندگی کو بہتر بنانے کے لیے لازمی ہے۔

مولانا صلاح الدین احمد

۲۔ م۔م۔راجندر جدید اردو افسانہ نگاری کا ایک اہم اور معتبر نام ہے۔ وہ ۱۹۴۲ء سے افسانے لکھ رہے ہیں اور اس لحاظ سے افسانہ نگاروں کی اس نسل سے تعلق رکھتے ہیں جو افسانوی ارتقا کے ہر پہلو بلکہ اس کی ہر منزل اور پڑاؤ سے واقف ہے۔ ان کا اسلوب سادہ مگر بڑا طاقتور اور اثر انگیز ہے۔

احتشام حسین

۳۔ م۔م۔راجندر اردو کے مشہور افسانہ نگار ہیں۔ ان کے افسانوں میں انسان دوستی کے پیام کی گونج سنائی دیتی ہے۔ ان کے افسانوں میں موضوع اور ہیئت کی ایسی ہم آہنگی پائی جاتی ہے جو افسانے کی ایک بڑی خوبی ہے۔

عبادت بریلوی

۴۔ م۔م۔راجندر ہمارے بہت سینئر اور اہم ادیب اور افسانہ نگار ہیں۔ ہم لوگ ان کے

افسانے پڑھ کر جوان ہوئے۔

شمس الرحمٰن فاروقی

۵۔ مجھے م۔م۔راجندر کے افسانوں سے محبت ہے۔ان کے فن کا ہاتھ بڑا مضبوط ہے۔ ان کے افسانوں کو پڑھ کر ان کی حیرت انگیز قوتِ بیان کا قائل ہونا پڑتا ہے۔وہ ہمارے دور کے بہت عمدہ افسانہ نگار ہیں۔

میرزا ادیب

۶۔ ادبی دنیا کے مولانا صلاح الدین احمد نے کیسوں کیسوں کو چمکا دیا۔ اُن میں م۔م۔راجندر بھی تھے۔جس کو مولانا صلاح الدّین احمد نے مان لیا گویا سب نے مان لیا۔تاریخ ورق پلٹ رہی ہے۔اس کے پھڑ پھڑاتے اوراق پر ایک اہم نام م۔م۔راجندر کا بھی ہے۔

گوپی چند نارنگ

۷۔ بات کہنے کا جو انداز م۔م۔راجندر کی کہانیوں میں ملتا ہے۔وہ کئی لوگوں کو عمر گزرنے کے بعد بھی نصیب نہیں ہوتا۔

(پروفیسر) شکیل الرحمٰن

۸۔ م۔م۔راجندر صاحب کی کہانیاں رسائل اور جرائد میں پڑھتا تھا اور خوش ہوتا تھا کہ اب بھی ہمارے درمیان کچھ باقیات الصالحات ہیں جو ستائش کی تمنا اور صلے سے بے نیاز ہو کر ہمارے افسانوی ادب میں گرانقدر اضافہ کر رہے ہیں۔

ملک زادہ منظور احمد

۹۔ م۔م۔راجندر کے افسانے میں ہمیشہ دلچسپی سے پڑھتا ہوں اور اُن میں زبان و بیان کا ایک نیا لطف محسوس کرتا ہوں۔جس سادگی سے وہ کہانی شروع کرتے ہیں اور پھر رفتہ رفتہ زندگی کے نشیب و فراز، اس کی مسرّتوں اور تلخیوں، ناکامیوں اور کامیابیوں سے گزر کر وہ اپنے اختتام تک

پہنچتی ہے تو عجیب سا احساس ہوتا ہے۔ سادگی سے شروع ہونے والی کہانی اختتام تک پہنچتے پہنچتے، روایتی کہانی نہیں زندگی کی کہانی بن جاتی ہے اور یہی ان کا فن ہے۔

شارب ردولوی

۱۰۔ یہ بہت بڑی بات ہے کہ م۔م۔راجندر صاحب اس دور میں بھی افسانے کے وہ معیار نبھا رہے ہیں جو اس کے لیے ایک زمانہ تک باعثِ افتخار رہے مگر اب جنھیں پسِ پشت ڈال دیا گیا ہے۔
ظہیر احمد صدیقی

۱۱۔ م۔م۔راجندر کے افسانے زندگی کے روشن اور مثبت تاثرات اور پرکشش لائق مطالعہ بیانیہ کی ہم آہنگی سے اپنی شناخت قائم کرتے ہیں۔ تجربہ کاری سے زیادہ کامیاب افسانہ نگاری کے تقاضوں کا احترام اُن کے یہاں مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔

بلراج کومل

۱۲۔ میں م۔م۔راجندر صاحب کا پرانا مدّاح ہوں اور اُن کی تحریروں کو ذوق اور شوق سے پڑھتا رہا ہوں۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی تامّل نہیں کہ اردو افسانہ نگاروں کی بھیڑ میں انھوں نے اپنے لئے ایک منفرد جگہ بنالی ہے۔

مجتبیٰ حسین

مصنّف کے سوانحی اشارے

تاریخِ پیدائش: ۲۱؍اگست ۱۹۲۳

جائے پیدائش: انبالہ چھاؤنی

ادبی زندگی : ۵۹ سال

تعلیم : ایم۔اے (اُردو و انگریزی ادبیات) آنرز اِن پرشین

تصنیفات اور تراجم

اردو

۱۔نقوش (افسانوں کا مجموعہ)
۲۔کھو کھلے انبار (افسانے)
۳۔آگ اور دھواں (ناول)
۴۔روشنی کے مینار (افسانے)
۵۔ایک لڑکی سپنوں کی (افسانے)
۶۔رنگ محل (افسانے)
۷۔باجی راؤ پیشوا اور مستانی (ڈرامے)
۸۔گھٹتی بڑھتی دھوپ چھاؤں (افسانے)
۹۔فکر و نظر (تنقیدی اور علمی مضامین)
۱۰۔زندگی کا رقص (افسانے)

ھندی

۱۱۔آگ اور دھواں (ناول)
۱۲۔آکاش گنگا (کہانیاں)
۱۳۔گنگو دادا کا اسکول (کہانیاں)
۱۴۔ایک دھنش سات رنگ (کہانیاں)
۱۵۔جلنے دو یہ دیئے پرانے (کہانیاں)
۱۶۔اندھیروں کا سفر (ناول)

انگریزی

۱۷۔ Dreams in our hearts
(Stories)

تراجم (انگریزی سے اردو)

۱۸۔آتم کتھا (گاندھی جی کی سوانح عمری)
ستا ساہتیہ منڈل
۱۹۔آنندو رام بروا (سوانح حیات)
ساہتیہ اکادمی
۲۰۔ماں (کارل چاپیک کا ڈرامہ)
غالب انسٹی ٹیوٹ
۲۱۔اچھوت (ملک راج آنند کا ناول)
ساہتیہ اکادمی
۲۲۔پہاڑ پر آگ (انیتا ڈیسائی کا ناول)
ساہتیہ اکادمی

اعزازات وانعامات

۱۔مہاراجہ رندھیر سنگھ کپورتھلہ ایوارڈ: بہترین کہانی کے لئے (۱۹۴۳)
۲۔روٹری کلب ایوارڈ برائے مثبت نگاری (۱۹۴۹)
۳۔''نئی تحریریں'' ایوارڈ برائے فکشن (۱۹۵۰)

۴۔ نیو ایٹلانٹک انٹرنیشنل ایوارڈ برائے کہانی (۱۹۵۹)

۵۔ غالب ایوارڈ (۱۹۸۵)

۶۔ سینٹرل ہندی ڈائرکٹوریٹ، حکومتِ ہند ایوارڈ برائے فکشن (۱۹۸۸)

۷۔ ہندی اکادمی دہلی ایوارڈ برائے فکشن (۱۹۹۱)

۸۔ اردو اکادمی دہلی ایوارڈ برائے بچّوں کا ادب (۱۹۹۳)

۹۔ اردو اکادمی لکھنؤ ایوارڈ: افسانوں کی کتاب پر (۱۹۹۵)

۱۰۔ ''امتیازِ میر'' کا خطاب اردو ادب میں مجموعی خدمات کے لئے۔ میر اکادمی لکھنؤ (۱۹۹۸)

۱۱۔ ساہتیہ اکادمی ایوارڈ برائے ترجمہ (۱۹۹۸)

۱۲۔ حکومتِ بہار، بھاشا وبھاگ کا راجہ رادھیکا رمن پرساد سنگھ ایوارڈ برائے مثبت نگاری (۱۹۹۹)

انتساب

اپنے اُن لاتعداد پڑھنے اور چاہنے والوں کے نام
جو مجھے دور دراز علاقوں سے محبت نامے بھیج کر مجھ پر کرم فرماتے ہیں۔
مگر میں بدنصیب اپنی متعدد مجبوریوں کے سبب انہیں جواب بھیج کر
اپنی ممنونیت کا اظہار بھی نہیں کر پاتا
اور المیہ احساسِ ندامت میں مبتلا رہتا ہوں۔

م۔م۔راجندر

ٹھہرے ہوئے لمحے

ہماچل پردیش میں، کلّو سے اٹھارہ کلومیٹر ادھر، ہمالیہ کے پہاڑوں سے اترتے، تیزی سے بہتے اور ہر وقت شور مچاتے ہوئے دریائے بیاس کے کنارے، ایک چھوٹا سا خاموش پہاڑی گاؤں وموِلی تھا۔ دریا اور اِس گاؤں کے بیچ صرف وہ بل کھاتی ہوئی ٹیڑھی سڑک تھی جس پر کبھی نہ ختم ہونے والی ہر قسم کی گاڑیوں اور بسوں کی آمدورفت رہتی تھی۔ وموِلی خود بھی چاروں طرف پہاڑوں سے گھرا ہوا تھا اور اس کے اندر سے ایک اور باہر سے کئی اطراف سے متعدد چھوٹے بڑے گول پتھروں سے اٹے ہوئے راستے اور تنگ سڑکیں گزرتی تھیں۔ آس پاس کے کئی گاؤں ایک دوسرے سے ان راستوں کے ذریعے ملے ہوئے تھے۔ ان راستوں پر لوگ پیدل چلتے تھے اور عموماً اپنا بوجھ اپنی پیٹھ پر لاد لیتے تھے یا پھر ٹٹو اور چھوٹے قد کے گھوڑے اور گائیں بھیڑ اور بکریاں ان پر چلتی تھیں۔ اس علاقے میں کسی کسی نے تبتی یاک بھی پال رکھی تھی۔ ان جانوروں کے ساتھ ان کا مالک یار کھوالا ہوتا بھی تھا اور نہیں بھی۔ اس علاقے میں چوری اور جرم برائے نام تھا اور مویشی اپنے راستوں، پہاڑوں اور ٹھکانوں کو بخوبی پہچانتے تھے اور پہاڑوں پر چر کر صحیح سلامت لوٹ آتے تھے۔ دریا اور سڑک پر گزرتی ہوئی گاڑیوں کے شور کے سوا اس علاقے میں کوئی اور شور نہیں تھا۔ وموِلی اور آس پاس کے دیہات کی زندگی از حد سادہ اور خاموش تھی۔

سارے علاقے میں صرف ایک سرکاری مڈل سکول تھا جو وموِلی سے ایک کلومیٹر دور ایک اونچے ٹیلے پر تھا۔ لڑکے اپنے بستے کمر پر لادے ہانپتے ہوئے چڑھتے تھے اور ہوا کی

مانند چیختے ہوئے نیچے اترتے تھے۔ چھٹی ہونے پر یہ لڑکے لہر در لہر اترتے اور اپنے اپنے راستے پر ہو لیتے۔ جب تک اپنے گھر نہیں پہنچ جاتے، خوب غل غپاڑہ کرتے مگر اس شور کو تو ہر وقت بسنے والی گہری خاموشی اور پہاڑوں کی پراسرار اونچائیاں ہی جذب کر لیتیں!

ہر گاؤں میں روزمرہ کی ضرورت کی چیزوں کی ایک چھوٹی سی دکان تھی مگر اس پر بھی گاہک شاذ ہی آتا اور یہ بھی خاموشی میں لپٹی رہتی اور سورج ڈھلنے سے بہت پہلے ہی بند ہو جاتی۔ لوگوں کے اپنے چند پھلوں کے درخت اور چھوٹی سی کھیتی تھی۔ کھیتی کا اناج گھر میں کام آتا تھا اور پھل دار درختوں پر جو آلو بخارے، آڑو اور سیب لگ جاتے انہیں پکنے پر ٹوکریوں میں ڈال کر سڑک پر سے گزرنے والے سیاحوں کو بیچ آتے یا کلّو اور منالی کے پھلوں کے بیوپاریوں کے ایجنٹوں کو جو سڑک پر ہی خیمہ لگائے بیٹھے رہتے، سستے دام پر بیچ دیتے۔ یہ نقدی ان کی دوسری ضرورتوں کو پورا کرتی تھی۔

دمولی کے باہر ایک ایسے ہی سنسان اور لمبے راستے پر ایک اونچے ٹیلے کے اوپر ایک چھوٹی سی عجیب وغریب دکان تھی۔ اس کا مالک ستر سالہ بجرنگ تھا جو منحنی جسم کا ایک لمبا آدمی تھا۔ اس کے سر کے بال بلکہ بھویں تک روئی کی طرح سفید ہو گئی تھیں۔ چہرے پر اگرچہ چند جھریاں پڑ گئی تھیں مگر رنگ ابھی تک سرخ وسفید تھا اور آنکھوں میں ایک مخصوص چمک تھی۔ وہ اپنا وہی پہاڑی لباس پہنے رہتا تھا جو اس نے ہمیشہ پہنا تھا یعنی ہاتھ کے بنے ہوئے موٹے اور کھردرے کپڑے کا اونچا پاجامہ اور کرتہ اور سر پر گول ٹوپی جس پر مخمل کی ہری یا لال پٹی لگی ہوتی۔ وہ دکان میں کام کرتے ہوئے کوئی پہاڑی گیت بھی گنگناتا رہتا تھا۔ یہ دکان اُس کے چھوٹے سے کھپریل اور لکڑی کے بنے ہوئے مکان کا ہی بیرونی حصہ تھی۔ پیچھے گھر سے ہی لگی ہوئی کوئی دس مربع گز زمین پر اس کی کھیتی تھی جس میں وہ چاول اور سبزی وغیرہ اگا لیتا تھا۔ اس کے اپنے چھ درخت آڑو اور آلوچے کے بھی تھے لیکن ان میں اب بہت تھوڑے پھل لگتے تھے اور ان میں سے بیشتر خود ہی نیچے گر کر خراب ہو جاتے تھے۔ بجرنگ کو پھل کھانے کا بالکل شوق نہیں تھا۔ اس کے گھر سے کبھی کسی اور آدمی، عورت، بچے یا جانور کی آواز سنائی نہیں دی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا وہ یہاں بالکل تنہا رہتا تھا۔

دمولی میں بجلی نہیں تھی۔ اس لیے بجرنگ لالٹین جلاتا تھا۔ شام کو بھی اور دن میں بھی جب کبھی بادل گھر آتے اور اندھیرا ہو جاتا، وہ اسی لالٹین کو اپنے ہاتھ میں لیے پھرتا رہتا

کیونکہ لالٹین ایک ہی تھی اور اس کے جانے کی جگہیں کئی یعنی اس کی دکان، اس کا گھر اور اس کی زمین۔ اس کی عمر کو دیکھتے ہوئے اس کی بینائی ٹھیک تھی۔ مگر جب بجرنگ کو کسی چیز سے ٹھوکر لگتی یا اس کو کسی چیز کے ڈھونڈنے میں دیر ہو جاتی تو وہ سوچنے لگتا کہ شاید اس کی نظر کمزور ہو گئی ہے۔ دمولی میں کوئی آدمی چاہے وہ بوڑھا ہو یا جوان عینک نہیں لگاتا تھا۔ اس لیے اُسے کلّو جا کر عینک لگوانے کا کبھی دھیان بھی نہیں آیا۔ وہ شام کو دیر تک اپنی لالٹین کی روشنی میں کام کرتا رہتا تھا۔ پہاڑوں میں سرِ شام ہی گھپ اندھیرا چھا جاتا تھا۔ ایسی تاریکی میں اس ٹیلے پر صرف بجرنگ کی لالٹین ہی ارد گرد کا چاندنا ہوتی تھی۔ وہ اپنی دکان اُسی وقت بند کرتا تھا جب اُسے سخت سردی لگنے لگتی یا طرح طرح کے جانوروں کی چیخوں کی خوفناک آوازیں آنے لگتیں۔ وہ دکان کا دروازہ بند کر کے کبھی کام نہیں کرتا تھا۔

اس تمام علاقے کے پہاڑی لوگ بڑے دھارمک خیالات کے اور پوجا پاٹھ کرنے والے تھے۔ وہ اپنے اعتقادات کے بڑے پکّے تھے چاہے بظاہر وہ کتنے بھی اُوٹ پٹانگ ہوں۔ خود بجرنگ سالہا سال سے اپنے گھر کے باغ سے ملی دیوار میں سے نکلے ہوئے پودے کو، جو پیپل کا بھی نہیں تھا جس کی ہندو پوجا کرتے ہیں، دودھ سے ہر روز نہلا کر اور اس کے سامنے بیٹھ کر گھنٹی بجاتا اور منتر پڑھتا تھا! اس خطے کے بارے میں یہ بھی مشہور تھا کہ یہاں رامائن سے متعلق یا رام کے عہد کی کچھ اہم دستاویزیں اور اشیا دستیاب تھیں چاہے وہ یہاں کے چھوٹے چھوٹے گمنام مگر قدیم مندروں میں ہوں یا لوگوں کے گھروں میں۔ اس تعلق سے قدیم تاریخ کے اسکالر اور محقق وقتاً فوقتاً یہاں آ کر لوگوں سے ملتے اور چھان بین کرتے رہتے تھے۔ سننے میں آیا تھا کہ کچھ ایسی اشیا اور چند نہایت قدیم انجانی زبان میں لکھی ہوئی دستاویزیں یہاں سے کئی سال پہلے دریافت بھی ہوئی تھیں۔

اسی سلسلے میں آج کل دمولی میں دیو سین گپتا نام کا ایک بنگالی ریسرچ اسکالر بنارس سے مزید معلومات حاصل کرنے اور تلاش و تحقیق کے لیے آیا ہوا تھا۔ اُسے اپنی تحقیق کے لیے سرکاری گرانٹ بھی ملی تھی۔ سین گپتا بنگالی صرف نام کا تھا کیونکہ ڈیڑھ سو برس سے اس کا خاندان بنارس میں گنگا کے گھاٹ پر ایک قدیم انحطاط پذیر حویلی میں آباد تھا اور اپنے طور طریقوں، عادات بلکہ اعتقادات میں بھی سب گھر والے اتر پردیش کے ہندو لگتے تھے۔ ہاں ان کی مستورات حویلی کے اندر بنگلہ ہی بولتی تھیں اور ان کا پہناوا بھی بنگالی عورتوں کا ہی

تھا۔ دمولی میں سین گپتا ایک برہمن کے گھر ٹھہرا ہوا تھا جو دمولی کے چھوٹے سے مندر کا پجاری بھی تھا اور یہاں کے سارے علاقے کی جانکاری رکھتا تھا۔ وہ اپنے ٹھہرنے اور کھانے کے لیے ہر روز پنڈت کو اتنے پیسے دے دیتا تھا کہ وہ خوش ہو جاتا تھا۔ اگر چہ اُسے یہاں رام اور رامائن کے تعلق سے اشیا اور دستاویز تو نہیں ملی تھیں مگر جس نے جو بتایا یا اس نے خود جو دیکھا اور محسوس کیا وہ مع حوالوں کے لکھتا جا رہا تھا۔ اس سارے علاقے کا اپنی معلومات کے اعتبار سے اس نے ایک نقشہ بھی بنا لیا تھا۔ وہ ایک ہفتے سے یہاں آیا ہوا تھا اور اب تین دن کے بعد اُس کا ارادہ یہاں سے چلے جانے کا تھا۔

جانے سے ایک دن پہلے، شام کے تقریباً چار بجے، جب سین گپتا ایک پہاڑی سے اتر کر نیچے پہنچا تو وہ سامنے کے ٹیلے پر بجرنگ کی دکان کو دیکھ کر ٹھٹھک سا گیا۔ اتنی سنسان جگہ پر اور اس اجاڑ راستے پر یہ دکان۔ اس کا ذکر اس کے میزبان پنڈت نے بھی اس سے نہیں کیا تھا حالانکہ یہ دمولی کی سرحد پر ہی واقع تھی۔ اس دکان کو دیکھ کر سین گپتا اچنبھے میں یوں پڑ گیا کیونکہ اس کے اندر چاروں طرف کھوپڑیاں سی لٹکی ہوئی تھیں اور ایسا لگا کہ ان کا ایک ڈھیر نیچے دکان کے فرش پر بھی پڑا ہوا تھا۔ مگر بغور دیکھنے پر اُسے یہ کھوپڑیاں بھی نہیں لگیں، کم از کم انسانی کھوپڑیاں تو نہیں۔ ایک کمزور سا بوڑھا آدمی جھکا ہوا ان پر اپنے اوزاروں سے کچھ کام کر رہا تھا۔ جہاں تک سین گپتا دیکھ سکا تھا بوڑھے کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی ہتھوڑی اور آری تھی۔ آفتاب پہاڑوں کے پیچھے روپوش ہونے والا تھا کیونکہ اس وقت اس کی شعاعیں کمزور اور خون کی طرح سرخ تھیں اور بجرنگ کی کھلی دکان کے عین بیچوں بیچ گھس کر تڑپ رہی تھیں۔ بائیں ہاتھ کے پہاڑ کے پیچھے بیاس دریا زیادہ ہیبتناک آواز میں دہاڑ رہا تھا کیونکہ جوں جوں شام ہوتی تھی اس کے بہاؤ میں تیزی آتی رہتی تھی اور اُس کی تہہ میں دن بھر کے ابھرے ہوئے پتھر پانی میں ڈوبتے جاتے تھے۔ سین گپتا سے نہ رہا گیا اور وہ اپنے تجسّس کی تسکین کے لیے سامنے کے ٹیلے پر دکان کی طرف جانے والے پگڈنڈی پر چڑھ گیا۔ جیسے ہی وہ دکان کے پاس پہنچا تو بجرنگ نے اس کے قدموں کی آہٹ سن لی۔ اُس نے اپنے کان کھڑے کیے اور سر اٹھایا تو ایک اجنبی اور باہر کے آدمی کو اپنی دکان کے سامنے کھڑا دیکھ کر چونک سا گیا۔ اس نے اپنی آری اور ہتھوڑی کو ایک طرف رکھ دیا اور مسکرا کر بولا۔

''باہر کے لگتے ہو۔ گھومنے آئے ہو گے۔ براجو۔ میرا نام بجرنگ ہے اور تمہارا؟''

بجرنگ نے بیٹھنے کے لیے اُس کی طرف ایک چھوٹی سی پیڑھی کھسکا دی اور سین گپتا اُس پر بیٹھ کر بولا۔

''باہر کا ہی ہوں۔ نام دیبو سین گپتا ہے۔ بنارس میں رہتا ہوں۔ کل واپس چلا جاؤں گا۔''

''بنارس یعنی کاشی؟ بہت پوتر ستھان ہے۔ کوئی سمبندھی ادھر ہیں؟'' بجرنگ نے خوش ہو کر پوچھا۔

''نہیں'' سین گپتا نے بکھری ہوئی کھوپڑیوں کی طرف ایک اچٹتی ہوئی سی نگاہ ڈالتے ہوئے کہا'' کام تو اب ختم ہو گیا۔''

سین گپتا نے یہ کہا ہی تھا کہ سورج کی قرمزی بے جان سی کرنیں چشم زدن میں ایسے سمٹ گئیں جیسے کسی نے بجلی کا بٹن دبا کر جلتی ہوئی بتی گل کر دی ہو۔ اسی لمحے سورج پہاڑوں کے پیچھے پورے کا پورا ڈوب گیا تھا۔ یکا یک سارا ماحول، سب چیزیں تاریک ہو گئیں۔ مگر اُسی وقت تیزی سے بجرنگ نے اپنی جیب میں سے ماچس نکالی اور پاس ہی رکھی ہوئی لالٹین جلائی اور دکان میں روشنی پھیل گئی۔ سین گپتا نے اطمینان کا سانس لیا اور بولا۔

''معاف کیجیے نیچے سے مجھے یہ کھوپڑیاں نظر آئی تھیں۔ انسانی کھوپڑیاں۔''

''یہ کھوپڑیاں ہی ہیں'' بجرنگ بولا'' اور انسانوں کی ہی ہیں۔''

''میں سمجھا نہیں'' سین گپتا کچھ تذبذب اور کچھ گھبراہٹ میں بولا۔ معاً اُسے یہ بھی خیال آیا کہ اس نے کتنی نادانی کی تھی کہ اس عجیب وغریب جگہ پر چڑھ آیا تھا۔

''میں سمجھاتا ہوں'' بجرنگ اطمینان سے بولا'' یہ کھوپڑیاں آدمیوں کی ہیں مگر لکڑی کی اور الگ الگ ناپ کی۔ انہیں میں نے خود اپنے درختوں کی لکڑی کاٹ کر بنایا ہے اور ان کے بنانے میں صرف میری محنت لگتی ہے۔ میرے پاس ہر جوان اور بوڑھے آدمی کے لیے پیلے اور گلابی رنگ کی تیار پگڑی ہے۔ ہوں گی کوئی بیس پچیس پگڑیاں۔ انہیں کھوپڑیوں پر باندھ کر رکھتا ہوں۔ ہم پہاڑی لوگ پگڑی نہیں پہنتے مگر بیاہ شادی کے موقعے پر جب بارات آتی اور جاتی ہے لڑکے کے سگے سمبندھی پیلے رنگ کی اور لڑکی کے گھر والے

گلابی رنگ کی پگڑی پہنتے ہیں۔ یہ پگڑیاں مجھ سے ایک دن کے لیے دس روپے پگڑی کے حساب سے کرایے پر لے جاتے ہیں۔ ہمارے یہاں باراتیں بڑی چھوٹی ہوتی ہیں۔ پانچ سے لیکر دس بارہ آدمیوں تک کی۔''

بجرنگ ایک منٹ کے لیے رکا اور پھر آہستہ سے بولا۔

''یہ کھوپڑیاں تو صرف ناپ کے لیے ہیں۔ آدمی کو دیکھ کر بندھی بندھائی پگڑی اپنی کھوپڑی پر سے اتار کر اس کی کھوپڑی پر رکھ دیتا ہوں۔ میری ان کھوپڑیوں کا سمبندھ موت سے نہیں زندگی سے ہے، اس کی بہاروں اور رونقوں سے یعنی شادی سے۔''

یہ کہہ کر بجرنگ اداس سا ہو گیا۔ اس نے لالٹین کی کم ہوتی ہوئی روشنی کو دیکھا اور پاس رکھی ہوئی بوتل میں سے مزید تیل ڈال کر اور چمنی کو کپڑے سے باہر سے صاف کر کے پیچ کو گھما کر بتّی کو ذرا سا بڑھا دیا۔ پھر بولا۔

''چائے پی لو۔ ابھی بنا دیتا ہوں۔''

''نہیں شکریہ'' سین گپتا بولا ''مگر پگڑی تو ایک بھی نظر نہیں آ رہی ہے۔ شاید اندر گھر میں ہوں گی۔''

''پگڑی اب کون لے جاتا ہے'' بجرنگ ایک آہ بھر کر بولا ''ایک تو ہمارے یہاں شادیاں صرف اپریل اور مئی میں ہوتی ہیں۔ مگر پہلے ان دو مہینوں میں ہی میری ہر دوسرے تیسرے دن ساری ہی پگڑیاں نکل جاتی تھیں اور اب ایک بھی نہیں جاتی۔ ایسا کئی برسوں سے ہو رہا ہے۔ پگڑیوں کو میں نے اندر کے اپنے رہنے کے کمرے میں ڈھیر کر رکھا ہے۔ اب تو خراب بھی ہو گئی ہیں اور پھٹنے لگی ہیں۔''

''مگر اس کی وجہ۔ کیا کوئی اور دکان کھل گئی ہے۔''

''دکان تو کوئی نہیں کھلی۔ وجہ مجھے نہیں معلوم۔ شاید لوگوں کی غریبی اور بڑھ گئی ہو۔ یا لوگوں نے گلابی اور پیلی پگڑیاں پہننے کی ریت ہی چھوڑ دی ہو۔''

بجرنگ یہ کہہ کر پھر کچھ سوچنے لگا۔ سین گپتا نے پوچھا۔

''تو پھر آپ یہ کھوپڑیاں کاٹ کاٹ کر کیوں ڈھیر کر رہے ہیں؟''

''کیا کروں'' بجرنگ بے چارگی کے لہجے میں بولا ''میرا وقت گزر جاتا ہے۔ دکان بنی رہتی ہے۔ زیادہ ہو جاتی ہیں تو ایندھن کے طور پر جلا لیتا ہوں اور پھر بنانے

لگتا ہوں۔ چکر تو چلتے رہنا چاہیے نا۔"

سین گپتا نے کھوپڑیوں کی طرف گھور کر دیکھا اور پھر فوراً نظریں اٹھا کر بجرنگ کے چہرے پر مرکوز کر دیں۔ وہ مسکرا رہا تھا اور لالٹین کی روشنی اس کے چہرے پر کچھ عجیب اور خوفناک نقوش بنا رہی تھی۔ سین گپتا نے جانے کا ارادہ کیا کیونکہ اندھیرا اور گہرا ہو گیا تو اس کا اپنے راستے پر چلنا بھی دشوار ہو جائے گا۔ تاہم اُس نے ایک سوال پوچھ لیا۔

"کیا آپ اکیلے ہیں؟"

"ہاں بالکل اکیلا اور کوئی پندرہ برس سے۔ پہلے ماں باپ گزرے، پھر میری گائے اور پندرہ برس پہلے اس سنسار میں میرا آخری سمبندھی، میری پتنی بھی گزر گئی۔ ہمارے کوئی بچہ نہیں ہوا تھا۔ اب صرف میں ہوں اور میری یہ کھوپڑیاں۔"

سین گپتا نے دیکھا کہ بجرنگ بالکل چپ ہو گیا تھا جیسے اس کا سارا وجود سو گیا ہو۔ پھر بجرنگ نے مسکرانا چاہا مگر وہ شاید ایسا کرنے میں ناکام رہا کیونکہ اُس کی آنکھوں میں چند آنسو ابھر آئے تھے۔

سین گپتا نے جانے کے لیے اجازت مانگی اور کھڑا ہو گیا۔ بجرنگ بھی کھڑا ہو گیا اور دیوار پر لٹکی ایک کھوپڑی کو اتار کر سین گپتا کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔

"اِسے میری طرف سے تحفے کے طور پر لے جانا چاہیں تو لے جائیں۔ نہ اچھی لگے تو نیچے اتر کر پھینک دینا۔"

سین گپتا نے ہاتھ بڑھا کر کھوپڑی پکڑی اور دکان سے باہر آ گیا۔ بجرنگ نے لالٹین اٹھائی اور ٹیلے کے کنارے پر کھڑے ہو کر سین گپتا کے لیے نیچے جانے والی پگڈنڈی پر روشنی ڈالنے لگا۔ سین گپتا نیچے اترتے ہوئے سوچنے لگا کہ اس تیزی سے دھڑکتی، شوریدہ دنیا میں کچھ ٹکڑے ایسے بھی تھے جہاں وقت ٹھہر کر منجمد ہو گیا تھا!

⁂ ⁂ ⁂

وہ دِن، وہ لوگ!

اتر پردیش میں حسن پور کی چھوٹی سی لکڑ اور اناج کی منڈی۔ آبادی کوئی بیس ہزار مسلمان اور ہندو تقریباً برابر کے۔ بھائی چارے، مروّت اور میل جول کی دلنواز تصویر۔ کوئی چالیس پینتالیس سال پہلے کا زمانہ۔ ماسٹر حکم چند مقامی مڈل اسکول میں ریاضی کے استاد تھے۔

وقت نے پلٹا کھایا۔ ماسٹر حکم چند کی چار لڑکیاں اور ایک لڑکا رام چندر تھا۔ لڑکیوں کی وہیں گردونواح میں شادیاں ہوگئیں۔ رام چندر چاروں لڑکیوں کے بعد ہوا تھا اور سب سے چھوٹا تھا۔ ماسٹر حکم چند پچاس سال کی عمر میں اسکول سے ریٹائر ہوگئے۔ قلیل پنشن مگر اپنے پشتینی گھر اور قناعت اور اسباب کے بیکراں خلوص کی دولت۔ اطاعت گزار اور شرافت کی پتلی بیوی کے ساتھ ایک مانوس اور ملے جلے سماج میں کبھی اکیلا پن محسوس نہیں کیا۔ رام چندر نے تعلیم مکمل کی تو اُسے بڑی دوڑ دھوپ کے بعد ملازمت دتّی میں ملی۔ دو سال اور گزرنے کے بعد اس کی شادی دتّی کے ہی ایک گھرانے میں ہوگئی۔ شادی کے دو سال بعد اس کی لڑکی کی پیدائش کے موقع پر ماسٹر حکم چند اپنی بیوی کے ساتھ کوئی تین ماہ تک دہلی ٹھہرے۔ حسن پور لوٹنے کے سال ڈیڑھ سال بعد بیٹے کے بے حد اصرار پر ماسٹر حکم چند نے سینے پر پتھر رکھ کر اپنا حسن پور کا جدّی مکان بیچ دیا اور ہمیشہ کے لیے دتّی منتقل ہوگئے۔ دلی آئے ہوئے بھی کئی سال ہوگئے اور عمر اب پچھتّر کی تھی۔ بڑھتی عمر کی نقاہت، گھٹے گھٹے ماحول اور بے حس، بے مروت اور بے گانہ سماج سے گھری ہوئی زندگی۔ ناتواں، بیمار

شریکِ حیات کا ساتھ مگر ایک نا تعلقی سی۔ دو تیزی سے پگھلتی ہوئی شمعیں۔

ایک روز بڑی گرمی تھی۔ ویسے وقت تو صبح کے گیارہ بجے کا تھا۔ ماسٹر حکم چند اور ان کی بیوی برآمدے میں چارپائی پر بیٹھے تھے۔ تھوڑی دیر میں ماسٹر حکم چند سہارے سے تکیے پر لیٹ گئے۔ جاگے ہوئے تھے یا نیند کی جھپکی آ گئی کہ ذہن حسن پور کی طرف پرواز کر گیا۔ اپنا کھلا ہوا گھر جس میں ایک نیم کا اور دو آم کے پیڑ لگے ہوئے تھے۔ منظور علی، حکیم خدا بخش اور پنڈت ہری چند کے احاطے اور منظور علی کی وسیع ڈیوڑھی میں ہر وقت لگنے والی محفلیں۔ ان سے گرمجوشی سے بغل گیر ہونا اور بے لوث محبت اور خلوص کی وہ چاندنی، جیسے حسن پور کبھی چھوڑا ہی نہ ہو۔ اور پھر کریما یاد آیا تو اس کی ساری داستان ان کے ذہن کے پردوں پر اجاگر ہونے لگی۔ جیسے تیس سال پہلے کے وہ لمحے آج بھی جی رہے ہوں۔

شرافت، اعلیٰ کردار اور مروت کا تعلق لازماً تعلیم، خاندان، مرتبے اور پیشے سے نہیں ہوتا اس کا ثبوت کریما کی ذات میں ملتا تھا۔ کریما ماسٹر حکم چند کے مکان کے بالمقابل بابو منظور علی کے مکان سے ملحق اور ان کی ہی ملکیت ایک چھوٹے سے کچے مکان میں رہتا تھا۔ وہ اپنے باپ شکور کی ہی طرح ٹھیلا چلاتا تھا اور اُس کا ٹھیلا بھی اُس کے باپ کا ہی بنوایا ہوا تھا اگرچہ بیل اس نے دو تین سال ہوئے بدل لیا تھا۔

کریما کا باپ شکور اب باسٹھ سال کا تھا اور کچھ بیمار رہنے کے سبب اب گھر پر ہی رہتا تھا۔ وہ اور کریما کی ماں نوراں زیادہ تر باہر چارپائی ڈالے بیٹھے رہتے تھے۔ نوراں اپنی جان پہچان والی عورتوں میں اٹھنے بیٹھنے بھی چلی جاتی تھی اور ان کے کام میں ان کا ہاتھ بٹا آتی تھی۔ وہ ہر لحاظ سے شرافت کا پیکر تھی اور اگرچہ کریما شکل وصورت اور ڈیل ڈول میں باپ کی ہو بہو تصویر تھا، شاید اس نے اپنی غیر معمولی شرافت اپنی ماں سے پائی تھی۔ کریما شادی شدہ تھا اور اُس کے دو لڑکے تھے جو مقامی مسجد کے اسکول میں پڑھنے جاتے تھے۔ اگرچہ کریما خود ان پڑھ تھا مگر شام کو دن بھر کی محنت کے بعد جب گھر لوٹتا اور بیل کھول کر کھونٹے سے باندھ دیتا تو اپنے بچوں کی کتابوں اور تختی اور سلیٹ کو ایسے دیکھتا جیسے وہ کوئی طلسماتی چیزیں ہوں اور بعض مرتبہ ازراہ تجسس یا جانکاری کے لیے وہ ان سے یہ بھی پوچھ لیتا کہ یہ ہندسہ کونسا ہے اور وہ لفظ کیا ہے۔ اسے اس بات پر بڑا فخر تھا کہ اس کے بچے اسکول میں پڑھتے تھے۔

کریما کوئی تیس سال کا تھا۔ قد تقریباً چھ فٹ اور خوبصورت کسرتی جسم۔ گندمی رنگ، کشادہ پیشانی اور چہرہ نمایاں طور پر وسیع اور متناسب۔ گھٹا ہوا سر اور مشین سے مہین کٹے ہوئے بال۔ کرتہ اور رنگین چارخانے کا تہبند پہنتا تھا اور گلے میں کالے دھاگے سے لٹکا ہوا مولوی صاحب کا تعویذ ہوتا تھا۔ وہ ہر روز شام کو منڈی سے لوٹ کر اور کچھ وقت اپنے بچوں کے ساتھ صرف کرکے منا پہلوان کے اکھاڑے چلا جاتا تھا اور وہاں محنت اور کسرت کرتا تھا۔ یہ معمول برسوں سے چلا آرہا تھا۔

کریما اگرچہ ایک ٹھیلے والا تھا مگر محلے میں کبھی کسی نے اسے گالی گفتار کرتے یا منہ سے کوئی قابل اعتراض جملے نکالتے نہ دیکھا تھا۔ وہ بڑی تمیز سے بات کرتا تھا اور دوسروں کو بھی جھگڑا لڑائی کرنے سے روکتا تھا۔ وہ سب کو ایک نظر سے دیکھتا اور سب کی عزت کرتا۔ محلے کے ہر لڑکے کو صحت بنانے کی تلقین کرتا۔ جسمانی طاقت کے باوجود اس میں غضب کا ضبط اور تحمل تھا اور اسے لڑائی یا تشدد پر اکسانا تقریباً ناممکن تھا۔ لیکن وہ کسی اخلاقی گراوٹ کو برداشت نہیں کرتا تھا اور اگر اُس کی تنبیہہ کے باوجود کوئی آدمی اپنی نازیبا حرکت سے باز نہیں آتا تو وہ کسی آتش فشاں پہاڑ کی طرح پھوٹ پڑتا اور اُس آدمی کی مرمّت کر ڈالتا۔

ایک روز جب کریما اپنے ٹھیلے پر کام سے واپس آرہا تھا تو اس نے محلے کے چند لڑکوں کو پلیا پر یاسین کے ساتھ بیٹھے دیکھا۔ یاسین حسن پور کا نامی بدمعاش تھا اور قصاب پورہ میں رہتا تھا۔ کریما نے گھر پہنچ کر بیل کھولا اور بغیر کچھ اور کئے پلیا پر پہنچ گیا۔ مگر اتنے میں یاسین جا چکا تھا۔ اُس نے لڑکوں کو تنبیہہ کی کہ وہ یاسین کے ساتھ کوئی سروکار نہ رکھیں اور نہ اُسے محلے میں آنے دیں۔ لڑکے کریما سے ڈرتے بھی تھے اور اس کی عزت بھی کرتے تھے۔ انہوں نے کل سے یاسین سے نہ بولنے کا وعدہ کیا۔ حمید نے کریما کو یہ بھی بتا دیا کہ یاسین نے ماسٹر حکم چند کی تیسری بیٹی بملا کا آج اُس کے اسکول سے یہاں تک پیچھا کیا تھا۔ یہ سن کر کریما آگ بگولہ ہو گیا اور اسی وقت یاسین کے محلے کی طرف روانہ ہو گیا اور اسے یہ تنبیہہ دے آیا کہ محلے کی ہر لڑکی اُس کی بہن ہے اور اگر کل سے اس نے اس کے محلے میں قدم رکھا تو اس کا انجام بہت برا ہوگا۔

اس کے کئی دن بعد کی بات ہے کہ کریما نے کام پر سے لوٹتے ہوئے یاسین کو

اپنے محلے سے نکلتے ہوئے دیکھ لیا۔اس نے اپنا ٹھیلا وہیں ایک طرف روک دیا اور اپنی چابک لے کر آناً فاناً یاسین پر ٹوٹ پڑا اور اُسے اُسی وقت چھوڑا جب اُس نے معافی مانگ کر کبھی محلے کی طرف رخ نہ کرنے کا وعدہ کرلیا۔اس کے بعد یاسین کو اس محلے میں کبھی نہیں دیکھا گیا۔

اِس طرح کریما اپنی دن بھر کی غیر حاضری کے باوجود محلے کی آبرو کا محافظ بھی تھا۔ جس روز چھٹی کرلیتا محلے کے لڑکوں کو اکٹھا کر کے انہیں اپنی صحت اور چال چلن بنانے کو کہتا۔ صحت کے لیے وہ کسرت کی اہمیت پر زور دیتا اور بعض مرتبہ خود کر کے بھی بتادیتا کہ ڈنڈ بیٹھک لگانے کا صحیح طریقہ کیا تھا۔ وہ اپنے محلے کے لڑکوں پر نگرانی کی نظر بھی رکھتا تھا۔ وہ حسن پور کے کونے کونے میں ٹھیلے پر مزدوری کرتا اور کوئی محلے کا لڑکا اِدھر اُدھر گھومتا ہوا مل جاتا تو اسے روک کر ضرور پوچھتا ''کیا آج اسکول نہیں گیا؟'' یا ''اتنی دور کیسے پھر رہا ہے؟ جاؤ واپس اپنے محلے میں۔''

ماسٹر حکم چند کی لڑکی بملا کی شادی نزدیک کے ہی ایک قصبے سرولی میں طے پا گئی تھی۔شادی کی تاریخ میں اب پندرہ دن رہ گئے تھے اور ماسٹر حکم چند سامان جٹانے اور دوسری تیاریوں میں مصروف تھے۔لڑکی کی شادی میں محلے والے بلا لحاظ مذہب وملت جٹ جاتے تھے اور ہر ممکن مدد کرتے تھے۔اس لیے تیاریوں میں کوئی بھی دشواری پیش نہیں آئی۔جیسا کہ دو بڑی لڑکیوں کی شادی میں ہوا تھا، حکیم خدا بخش نے اپنی پرانی حویلی جو خالی رہتی تھی پوری طرح صاف کرواکے بارات کے ٹھہرنے کے لیے دے دی تھی۔اس میں کمروں میں بچھانے کے لیے دریاں، چادریں، گاؤ تکیے وغیرہ بابو منظور علی، پنڈت ہری چند اور خود حکیم صاحب کے گھر سے ماسٹر حکم چند کے گھر ایک ہفتہ پہلے پہنچ گئے تھے۔پانی بھرنے کے لیے چار بڑی ناندیں بھی جب مل گئیں تو ماسٹر حکم چند نے شادی سے تین دن پہلے یہ سامان حویلی میں بھجوانےکی سوچی۔اس کے لیے انہوں نے شام کو اپنے لڑکے رام چندر کو بھیج کر کریما کو بلوایا۔وہ فوراً چلا آیا اور آتے ہی ہاتھ جوڑ کر ماسٹر جی کو' جے رام جی کی'۔ ماسٹر حکم چند کچھ حیران سے ہوئے کیونکہ کریما جب کبھی انہیں ملتا تو 'سلام ماسٹر جی' کہتا۔انہوں نے از راہِ خوش دلی کہا۔

''کریما آج یہ جے رام جی کیسے۔مجھے تو تمہارا سلام کہنا ہی اچھا لگتا ہے۔''

''ماسٹر جی سلام بھی وہی ہے اور جے رام جی کی بھی وہی۔ کسی کو سلام کہہ دو۔ کسی کو جے رام جی کی کردو۔ آپ پڑھے لکھے ہیں اور مجھ سے زیادہ جانتے ہیں کہ بھید کچھ ہے نہیں۔''

کریما مسکرا رہا تھا اور اس کی مسکراہٹ میں تصنع نام کو بھی نہیں تھا۔ ماسٹر حکم چند نے کہا۔

''حکیم صاحب کی پرانی حویلی میں کچھ سامان لے جانا ہے۔ ٹھیلے کی ضرورت پڑے گی۔ صبح منڈی جانے سے پہلے ہی میرا کام کر دینا۔ دو چکر لگیں گے۔ ایک مزدور اور مل جائے تو لے آنا کیونکہ کچھ سامان بھاری ہے۔''

''ماسٹر جی'' کریما بولا ''کسی اور مجور کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ مجھے ذرا سا ہاتھ لگانے والا چاہیے۔ میں صبح آٹھ بجے آ جاؤں گا۔''

اگلے روز کریما آ گیا اور اس نے خود ہی سامان اٹھا کر اپنے ٹھیلے پر لادلیا۔ پیتل کی بھاری ناندوں کے اٹھانے میں اس نے صرف رام چندر سے ذرا سا سہارا لگوایا ہوگا مگر ماسٹر حکم چند کو اس نے کسی سامان کو ہاتھ بھی لگانے نہیں دیا۔ وہ کریما کی جفاکشی اور طاقت کو دیکھ کر بڑا خوش ہوئے۔ جیسا کہ امید تھی دو چکر میں سارا سامان چلا گیا۔

ماسٹر حکم چند ہاتھوں میں روپے لئے گھر پر کھڑے رہے کہ دوسرے چکر کے بعد کریما لوٹے گا تو ٹھیلے کی مزدوری اُسے دیدیں گے۔ مگر رام چندر نے لوٹ کر بتایا کہ وہ تو کام کرنے لکڑ منڈی چلا گیا۔

''تو نے اُسے کہا نہیں کہ اپنی مزدوری کے پیسے گھر سے لیتا جا۔'' ماسٹر حکم چند نے اُس سے پوچھا۔

''میں نے کہا تھا پتا جی'' رام چندر بولا ''مگر وہ یہ کہتا ہوا اپنے ٹھیلے پر بھاگ گیا کہ گھر والوں سے مزدوری نہیں لی جاتی۔''

ماسٹر حکم چند شام کو سات بجے کے بعد روپے لے کر کریما کے گھر پہنچے۔ کریما کام سے لوٹ آیا تھا اور نہا دھو کر باہر چارپائی پر ہی بیٹھا تھا۔ پاس ہی پیچھے کی طرف اس کی بوڑھی والدہ نوراں ایک پیڑھی پر بیٹھی تھی۔ وہ ماسٹر جی کو دیکھتے ہی اٹھ گیا اور سلام کے بعد اپنی والدہ سے بولا۔

''امّاں ماسٹر جی صبح کے کام کے پیسے دیویں ہیں۔''

نوراں وہیں سے بولی۔

''گھر کے کام کی بھی کوئی مجوری لیتا ہوگا بیٹا۔ یہ ٹھیلا پہلے محلّے کا ہے اور پھر منڈی کا۔ ہم ایک پیسہ نہیں لیں گے۔''

ماسٹر حکم چند نے بڑی ضد کی مگر کسی نے ایک نہیں سنی۔ اتنے میں کریما کا لڑکا اُن کے لیے شربت کا گلاس لے آیا۔ کریما نے مسکرا کر انہیں شربت پینے کو کہا۔ وہ کریما کے اپنے جائز مزدوری کے پیسے نہ لینے پر بڑے تذبذب اور کشمکش میں تھے۔ یہ تو اس کا حق تھا اور وہ حق تلفی کے احساس میں مبتلا تھے۔ انہوں نے ایک انجانے جذبے کے تحت شربت کا گلاس پکڑ لیا اور اسے غٹا غٹ پی گئے۔

کوئی چھ سات برس بعد کی بات ہے کہ ایک روز خبر آئی کہ لکڑ منڈی میں کریما کے کندھوں پر کئی بھاری شہتیر گر پڑے اور اسے یہاں سے پانچ میل دور رام پور کے ہسپتال لے گئے ہیں۔ ماسٹر حکم چند، بابو منظور علی، پنڈت ہری چند، حکیم خدا بخش اور کئی محلے والے خبر ملتے ہی حکیم صاحب کے ٹریکٹر میں سوار ہو کر ہسپتال پہنچ گئے۔ کریما درد سے بری طرح کراہ رہا تھا۔ منڈی کے کئی بیوپاری اور ٹھیلے والے بھی موجود تھے۔ پتہ لگا کہ جب کریما اپنے ٹھیلے پر لادنے کے لیے دیوار کے سہارے کھڑے ہوئے بکّے اور وزنی شہتیروں کو ایک ایک کر کے نکال رہا تھا تو اچانک کئی شہتیر اس پر گر پڑے اور وہ بری طرح زخمی ہوگیا۔

کریما کوئی چار مہینے ہسپتال میں پڑا رہا۔ اس کے کندھوں، کمر اور دائیں بازو میں شدید چوٹیں آئی تھیں اور کئی جگہ سے ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ وہ ہمیشہ کے لیے بوجھ اٹھانے سے معذور ہوگیا۔ اس اثنا میں اس کے گھر والوں کی مالی امداد کچھ محلے والوں نے اور کچھ لکڑی کے بیوپاریوں نے کی تھی۔ ہسپتال میں جو بھی خرچہ آیا وہ پورے طور پر بیوپاریوں نے ادا کیا۔

جس روز کریما ہسپتال سے ڈسچارج ہو کر گھر لوٹا تو اس کے گھر پر محلے والوں کی خاصی بھیڑ اکٹھی ہوگئی۔ کریما باہر ہی کمبل اوڑھ کر چارپائی پر لیٹ گیا۔ اس کے چہرے پر وہی معصوم سی مسکراہٹ تھی اور وہ کسی کو سلام اور کسی کو جے رام جی کی کہہ رہا تھا۔ اچانک وہ بندو درزی کی طرف دیکھ کر بولا۔

''بندو بھائی اب مجوری نہیں کرسکوں گا۔ دایاں ہاتھ کام نہیں کرے گا۔ بائیں

ہاتھ سے پتہ نہیں کچھ کام ہوگا کہ نہیں۔ کچھ اپنا کام سکھا دینا۔ سنا ہے پاؤں سے چلنے والی مشین آتی ہے۔ پیٹ تو بھرنا ہی ہے۔ کہوتو کل سے ہی دکان پر آ جاؤں بس اتنا کر دینا کہ کرتے اور پاجامے سی لوں پھر سلائی کی مشین خرید لوں گا اور گھر پر ہی کام کیا کروں گا۔‘‘

بندو فوراً ہی رضا مند ہو گیا۔ ماسٹر حکم چند اور دوسرے سب اس بات پر متفق تھے کہ کریما کے لیے یہی کام موزوں رہے گا۔ ماسٹر حکم چند، بابو منظور علی اور حکیم خدا بخش نے مل کر کریما کے لیے مشین خریدنے کی ٹھان لی اور کوئی پندرہ دن میں ہی پاؤں کی مشین رام پور سے خرید لی گئی اور اُسے کریما کے گھر بھجوادی۔ کریما اور اس کے گھر والے اپنے جذبۂ احسان مندی کا اظہار ہاتھ جوڑ کر اپنی خاموش نگاہوں سے کر رہے تھے۔ مگر ماسٹر حکم چند اور ان کے ساتھی جانتے تھے کہ انسانیت کے ناتے یہ تو ان کا فرض تھا۔

کریما چند مہینوں میں درزی کا چھوٹا موٹا کام سیکھ گیا۔ یہ مشین جو پاؤں سے چلنے کے علاوہ خاص طور پر بائیں ہاتھ کے استعمال کے لیے بنی تھی بندو نے کریما کے گھر سے اپنی دکان پر ہی منگوالی تھی تاکہ کریمو اُسی پر کام سیکھ سکے۔ پھر کام سیکھنے کے بعد کریما یہ مشین اپنے گھر پر لے آیا اور کام کرنے لگا۔ محلے کے تمام گھروں سے چھوٹا موٹا کام اُسے ملنے لگا۔ محلے والوں کو افسوس یہی تھا کہ طاقتور اور بجلی کی سی تیزی رکھنے والا کریما اب ایک اپاہج تھا۔

ایک روز شام کو ماسٹر حکم چند یہ دیکھ کر بڑے حیران ہوئے کہ کریما کا بڑا لڑکا رحیم جو اب تیرہ سال کا تھا اور آٹھویں میں پڑھ رہا تھا، منڈی کی طرف سے اپنے باپ کا ٹھیلا دوڑاتا ہوا آ رہا تھا۔ انہیں ایسا لگا کہ وہ دن بھر مزدوری کر کے لوٹ رہا تھا۔ وہ اپنے باپ کی ہی طرح قدآور اور طاقت ور نکل رہا تھا۔ ماسٹر حکم چند کو یہ دیکھ کر دکھ ہوا کہ شاید ان کا گزارہ نہیں چل رہا تھا اور رحیم پڑھائی چھوڑ کر ٹھیلا چلانے پر مجبور ہو گیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ماسٹر حکم چند کریما کے گھر پہنچے تو ان کے کچھ پوچھنے سے پہلے ہی کریما بولا۔

’’رحیمو اس سال آٹھویں پاس کرلے گا۔ وہ اور دو سال میں دسویں کرلے گا۔ دسویں کی پڑھائی بڑی سخت ہوتی ہے اور اسے آٹھویں کے بعد وقت نہیں ملے گا۔ رحیمو خود بھی پڑھ لکھ کر بابو بننا چاہتا ہے۔ شوق سے بن جائے۔ مگر میں نے اسے کہا کہ آٹھویں کا امتحان دینے سے پہلے ایک دفعہ ٹھیلے کی مجوری کرلے۔ آخر اُس کے دادا اور ابا نے بھی تو ٹھیلا چلایا ہے۔ انسان کو اپنے پرکھوں کے پیشہ پر ناز ہونا چاہیے۔ رحیمو میری بات سنتے ہی

بیل ٹھیلے میں جوت کر نکل گیا اور پورے ساڑھے چھ روپے کی مجوری کر کے لوٹا ہے۔ بالکل میری طرح چلاتا ہے اور ہوا کی طرح ٹھیلے کو لے گیا۔ اب کل یہ ٹھیلا اور بیل بک جائیں گے۔ رحیمو تو بابو بنے گا۔''

''کیا ٹھیلا بیچ رہے ہو؟'' ماسٹر حکم چند نے پوچھا۔

''اور کیا کریں ماسٹر جی'' کریما بولا ''بیل ڈیڑھ سال سے کھڑا کھا رہا ہے۔ اب تک یوں نہیں بیچا کیونکہ بیل اور اولاد کو ہم ایک سا سمجھتے ہیں۔ یہ بیل آٹھ سال سے ہمارے پاس ہے لیکن کب تک کھڑے کو کھلائیں گے۔ گاہک مل گیا ہے۔ کل بیل اور ٹھیلا دونوں لے جائے گا۔''

یہ کہہ کر کریما بیل کی طرف بڑھا اور اُس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ ماسٹر حکم چند جانے لگے تو مسکرا کر اپنا بایاں ہاتھ اٹھا کر بولا۔

''ماسٹر جی سلام اور جے رام جی کی۔''

کریما کسی شگفتہ پھول کی طرح مسکرا رہا تھا۔ انجانی خوشی کے اس لمحے میں وہ شاید بھول گیا تھا کہ کبھی اُسے اتنی چوٹ لگی تھی اور یہ کہ کل اُس کا ٹھیلا اور بیل اُس کے دروازے پر نہیں ہوں گے!

...... ماسٹر حکم چند ہڑبڑا کر اٹھ گئے اور پھٹی پھٹی نظروں سے ادھر ادھر دیکھنے لگے۔ نہیں، یہ ان کا حسن پور نہیں تھا۔ وہ تو دلی میں ہی اپنے بیٹے کے گھر میں تھے۔ اف وہ دن کے گیارہ بجے ہی کتنی گہری نیند سو گئے تھے۔ دھوپ سارے برآمدے میں پھیل گئی تھی اور ان کی پتنی ان کے پاس سے اُٹھ کر کب کی اندر جا چکی تھی۔ وہ بمشکل اٹھے اور چارپائی کے سرہانے رکھی ہوئی اپنی چھڑی کے سہارے آہستہ آہستہ اندر جانے لگے۔ مگر یہ کیا، ان کی آنکھیں کیوں بھیگ گئی تھیں؟ شاید پرانی خوشگوار یادوں کا ہجوم بھی بڑا دل گیر ہوتا ہے اور سوئے ہوئے آدمی کو بھی آبدیدہ کر جاتا ہے!

محور

اگرچہ رام اوتار ہندوؤں کے متبرک شہر اجین میں ایک متوسط ہندو گھرانے میں پیدا ہوا تھا اور وہیں پلا پڑھا تھا مگر وہ دھرم کی طرف مائل نہیں تھا۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ وہ اس تعلق سے لامذہب سا تھا۔ اس کے گھر میں سب کا مندر جانا اور گھر میں موقع بہ موقع پوجا پاٹھ اور کتھا کیرتن کرانا ایک معمول تھا۔ مگر جب رام اوتار کو بھی شامل ہونے کے لیے کہا جاتا تو وہ ٹال جاتا اور اگر باپ کی ڈانٹ ڈپٹ سے شریک بھی ہو جاتا تو یہ صرف ایک دکھاوے کی بات ہوتی اور وہ دل سے ایسا نہ کرتا۔

رام اوتار نے سناتن دھرم انٹر کالج اُجین سے انٹرمیڈیٹ کا امتحان پاس کرنے کے بعد آگے پڑھنے کی بجائے ہندی کی ٹائپنگ سیکھ لی اور اِس کے کوئی دو مہینے بعد اُس کی اجین میونسپل کمیٹی میں نوکری لگ گئی۔ اُس وقت اُس کی عمر انیس سال کی تھی۔ اُس کی یہ نوکری سفارش کی بنا پر لگی تھی کیونکہ رام اوتار کے پتا جی کی جو ہائی اسکول میں ٹیچر تھے ڈپٹی کمشنر کے دفتر میں ایک جان پہچان نکل آئی تھی۔

اِس ملازمت کے بعد رام اوتار کی زندگی ایک ڈھرّے سے لگ گئی۔ دن بھر دفتر میں گزر جاتا مگر شام کو جی نہ گھر میں پہلے لگتا تھا، نہ اب لگتا۔ اُس کے دو تین پرانے دوست تھے، ان میں سے کسی کے گھر چلا جاتا اور اس کو ساتھ لے کر بازاروں اور سڑکوں پر گھومتا رہتا۔ ان دوستوں میں کرشن گوپال اس کو سب سے زیادہ پسند تھا۔ وہ اسکول اور کالج میں اس کا ہم جماعت رہا تھا اور بہت ہوشیار اور دانا تھا۔ دھرم کے معاملے میں بھی وہ آزاد خیال

تھا مگر جو دھرم اُس کا تھا وہ اُسے مانتا تھا اور ہر منگل کو ہنومان مندر میں پرشاد چڑھاتا تھا۔ رام اوتار نے دھرم کے بارے میں جو شکوک وشبہات اس کے سامنے ظاہر کیے تھے، ان کا ازالہ کرنے میں وہ تقریباً کامیاب ہوا تھا۔ اس نے کہا تھا۔

''دیکھ رام اوتار میں کوئی گیانی یا پنڈت نہیں ہوں مگر اتنا جانتا ہوں کہ تقریباً سو فیصدی لوگوں کا دھرم وہ ہوتا ہے جس میں وہ پیدا ہوتے ہیں یعنی جو ہمارے باپ اور پرکھوں کا ہوتا ہے۔ ہمیں اُس سے جڑے رسم ورواج اور پوجا عبادت کے طریقوں پر سوال اٹھانے کا کوئی اختیار نہیں۔ میں تو اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ دنیا کے سب مذاہب ایک ہی منزل کے مختلف راستے ہیں اور ہمیں سب مذاہب اور دھرموں کا آدر کرنا چاہیے۔''

رام اوتار کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی اور اس کے ذہن کا غبار ڈھل سا گیا۔ وہ کرشن گوپال کے ساتھ کئی بار مندر بھی گیا اور اُس نے کسی قسم کی بیزاری یا گھٹن کا احساس نہیں کیا جو وہ پہلے کرتا تھا۔ اگر اُس کا بس چلتا تو وہ ہر شام اور ہر چھٹی کرشن گوپال کے ساتھ گزارتا۔ مگر کرشن گوپال نے بی۔ اے میں داخلہ لے لیا تھا اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ اُس کی وجہ سے اُس کی پڑھائی کا حرج ہو۔

بہت دنوں بعد کی بات ہے کہ رام اوتار نے رات کو ایک خواب دیکھا کہ وہ بہت بوڑھا اور کمزور ہے اور کسی بھی وقت موت کی آغوش میں سما جائے گا۔ اُس نے کاغذ اور قلم سنبھالا اور یہ وصیت لکھ ڈالی۔

ا۔ میری موت پر کوئی پوجا پاٹھ نہ کیا جائے اور نہ کوئی رسوم کی ادائی ہو۔ نہ لاش کو شمشان گھاٹ لے جانے سے پہلے یا وہاں پہنچنے پر غسل کرایا جائے۔ یہ سراسر لاش کی بے حرمتی ہے۔ موت ہوتے ہی میرے جسم اور چہرے کو مکمل طور پر میرے پہنے ہوئے کپڑوں سمیت ڈھک دیا جائے اور چہرہ کسی کے درشن کو نہ کھولا جائے۔ مرنے والے کے آخری درشن کے کوئی معنی نہیں ہیں۔

۲۔ میرے جسم کو سپردِ آتش کرنے کے بعد بھی کوئی رسم نہ ہو، پھول چننے کی یا کسی پوتر ندی میں استھیاں بہانے کی بھی۔ نہ بعد میں کسی بیٹھک کی ضرورت ہے۔

رام اوتار نے اپنی اس وصیت کا آخری فقرہ لکھا ہی تھا کہ اس کی آنکھ کھل گئی اور وہ ہڑبڑا کر اٹھ گیا۔ یہ احساس کر کے کہ وہ زندہ ہے وہ بڑا خوش ہوا۔ وہ صرف اکیس سال کا تھا

اور اس کی تو ابھی شادی بھی نہیں ہوئی تھی۔ وہ حیران تھا کہ اسے یہ سپنا کیوں آیا۔

اس نے اسی شام کو اس کا ذکر کرشن گوپال سے کر دیا۔ کرشن گوپال نے پہلے تو رام اوتار کو گھور کر دیکھا اور پھر ایک زور کا قہقہہ لگا کر قدرے غیر سنجیدگی سے بولا۔

''ابے یہ خواب تیرے دماغ کے فتور یا خلل کا نتیجہ ہے۔ تو جو اپنے دھرم اور مدتوں سے رائج رسم ورواج کے بارے میں الٹا سیدھا سوچتا رہا ہے۔ میں نے تجھے پہلے بھی کہا تھا کہ میں اور تم بہت معمولی آدمی ہیں۔ کوئی فلاسفر یا ریفارمر نہیں جو اپنے دماغ کو ان باتوں میں الجھائیں۔''

''لیکن میں تو اب بدل گیا ہوں۔ مندر بھی جاتا ہوں۔'' رام اوتار بولا۔

''مگر کبھی تو تیرے دماغ میں یہ خیالات تھے۔ خواب ان ہی باتوں کے آتے ہیں جو ہم سوچتے ہیں۔''

اجین میں اگرچہ ہندوؤں کی آبادی بہت زیادہ تھی مگر مسلمان بھی کافی رہتے تھے اور شہر میں کئی مسجدیں اور ایک جامع مسجد بھی تھی۔ کچھ آبادی عیسائیوں کی بھی تھی اور انہوں نے شہر کے بیرونی علاقے میں اندور جانے والی سڑک پر ایک چھوٹی سی عمارت کو گرجے میں تبدیل کر لیا تھا۔ ایک چھٹی کے دن رام اوتار کرشن گوپال کے ساتھ بڑے بازار میں گھوم رہا تھا کہ کرشن گوپال اچانک بولا۔

''میں ذرا جامع مسجد میں جا کر دعا مانگ کر آتا ہوں۔ تجھے چلنا ہے تو بھی چل ورنہ میں تجھے پندرہ بیس منٹ میں چھنا مل حلوائی کی دکان پر مل جاؤں گا۔ میرا انتظار کریو۔''

مسجد بائیں ہاتھ پر ذرا سی دوری پر تھی۔ مگر رام اوتار بھونچکا سا ہو کر کرشن گوپال کے چہرے کو تکنے لگا۔ پھر بولا۔

''ابے تیرا دماغ تو نہیں خراب ہو گیا؟ ہندو ہو کر مسجد میں دعا مانگے گا؟ مسجد میں تجھے گھسنے کون دے گا''

''دیکھ میں جب کبھی اِدھر آتا ہوں اس مسجد میں ضرور جاتا ہوں۔ مجھے کبھی کسی نے نہیں روکا۔ پھر یہ نماز کا وقت تو ہے نہیں جو میں خلل انداز ہوں گا۔ بس باہر جوتے اتارنے پڑتے ہیں تو وہ مندر میں بھی اتارنے پڑتے ہیں۔ اندر داخل ہونے سے پہلے یہ رومال سر پر باندھ لیتا ہوں اور منبر کے سامنے کھڑے ہو کر اور ہاتھ پھیلا کر دعا کر لیتا ہوں۔

اب مجھے تو کوئی دعا نہیں آتی۔ بس سب کی خیریت مانگ لیتا ہوں۔ مجھے اس سے بڑا سکون ملتا ہے اور من میں سکھ شانتی رہتی ہے۔ میں تو کہتا ہوں تو بھی چل۔''

رام اوتار کرشن گوپال کے ساتھ ہولیا اور دونوں جامع مسجد کی طرف بڑھنے لگے۔

رام اوتار کے دل میں کچھ ڈر بھی تھا کیونکہ اس طرح دن دہاڑے دو ہندو نوجوانوں کا مسجد میں گھسنا کسی بھی آفت کا موجب بن سکتا تھا۔ مسجد کی کوئی دس بارہ سیڑھیاں طے کر کے یہ اوپر صدر دروازے پر پہنچے۔ باہر کے چبوترے پر ایک آدمی تخت پر بیٹھا ہوا تھا اور اس کے برابر میں ایک مقفل بکس رکھا تھا جس میں نمازی یا زائرین خیرات کے پیسے ڈالتے ہوں گے۔ دونوں نے جوتے اتار کر ایک طرف رکھ دیئے۔ کرشن گوپال نے جیب میں سے ایک روپے کا سکہ نکال کر بکس میں ڈال دیا اور ایک روپیہ رام اوتار کی طرف بڑھا کر بولا۔

''لے تو بھی ڈال دے''

''میرے پاس ہیں پیسے'' رام اوتار نے جیب میں سے دو روپے کا ایک نوٹ نکالا اور بکس میں ڈال دیا۔ دونوں مسجد میں داخل ہو گئے۔

مسجد کا صحن بڑا کشادہ تھا اور اس وقت بڑا فرحت بخش لگا۔ مسجد میں اس وقت صرف دو آدمی تھے اور وہ بھی سامنے کے حجرے میں اندر بیٹھے ہوئے تھے۔ کرشن گوپال نے اپنا رومال سر پر ڈال لیا تھا اور وہ سیدھا بائیں ہاتھ پر منبر کے نیچے جالی دار برآمدے میں پہنچا اور پیچھے کو کھڑے ہو کر اُس نے مسلمانوں کی طرح دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیئے۔ اس سے پہلے وہ برآمدے میں داخل ہوتے ہوئے اس کی خاک کو جھک کر ماتھے سے لگا چکا تھا۔ رام اوتار مسجد کے صحن میں کھڑا رہا اور اسے دیکھتا رہا۔ کرشن گوپال نے دعائیہ انداز میں کھڑے ہوئے کوئی پانچ منٹ لگا دیئے۔

جب وہ مسجد سے نکل کر باہر بازار میں آ گئے تو رام اوتار بولا۔

''یہ تو ٹھیک نہیں کر رہا ہے۔ ایک ہندو ہو کر تو مسجد جاتا ہے۔ اگر تیرے گھر والوں نے یا کسی واقف کار ہندو نے تجھے دیکھ لیا تو بچو تیری مرمت ہو جائے گی۔''

''میں نہیں سمجھتا کہ مجھ سے کوئی گناہ یا قصور سرزد ہو رہا ہے۔ لیکن جس روز بھی میں یہاں آتا ہوں میرا وہ دن بڑی خوشی اور سکون کا گزرتا ہے۔ اور رام اوتار میں نے دوسروں کے دھرم اور مذہب کا آدر کرنا ایک مسلمان سے ہی سیکھا ہے۔''

''وہ کیسے؟''

''محلہ داتا گنج میں ایک ریٹائرڈ جج شفیق اللہ صاحب رہتے ہیں۔ ہم انہیں جانتے ہیں۔ میں نے کئی بار دیکھا کہ وہ جب کبھی گوری شنکر کے مندر کے سامنے سے گزرتے تو ادھر منہ کر لیتے اور نہایت ادب سے سر جھکا کر گزرتے۔ ایک دن میں نے ان سے پوچھ لیا تو بولے کہ برخوردار ہر مذہب میں عبادت اور پرستش تو اسی خالق کی ہوتی ہے۔ کسی بھی عبادت خانے کے پاس سے گزرنا اور اس کی حرمت نہ کرنا بعید از اخلاق ہے۔''

بات یہیں ختم ہوگئی اور کچھ دیر دونوں چپ چاپ چلتے رہے۔ وہ دن رام اوتار کا بھی بڑا اچھا گزرا۔ جب رام اوتار کو نوکری کرتے تین چار سال ہوگئے تو اُس کے گھر میں اس کی شادی کا ذکر ہونے لگا۔ اس ذکر سے زیادہ گھر میں برادری کے وہ لوگ آنے لگے جن کے یہاں شادی کے لائق لڑکی تھی۔ لیکن کامیاب ہوئے بابو درگا پرشاد جن کی شہر میں اسکول کی کتابوں اور اسٹیشنری کے سامان کی دکان تھی۔ ان کی میٹرک پاس لڑکی کا نتا سب کو پسند آ گئی۔ اس کے دو ماہ بعد ہی نہایت ہنسی خوشی کے ماحول میں اور پورے ریت رواجوں کے ساتھ رام اوتار کی شادی ہوگئی۔ بلاشبہ اس شادی میں اس کا جگری دوست کرشن گوپال بھی شامل ہوا۔

شادی کے بعد رام اوتار کی زندگی کچھ نئی مسرّتوں سے ہمکنار ہوگئی تھی اور اُس نے بطور انسان کے اپنے آپ کو زیادہ مکمل محسوس کیا۔ اس اثنا میں کرشن گوپال نے تواریخ میں ایم۔ اے کر لیا تھا اور شہر میں جو دو تین کالج تھے ان میں لیکچرار کے طور پر ملازمت حاصل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اب اُس کا اور رام اوتار کا اتنا ملنا جلنا نہیں ہوتا تھا جتنا پہلے تھا۔ مگر رام اوتار کے دل میں کرشن گوپال کے لیے بڑی قدر تھی۔ ایک روز جب اُسے پتہ لگا کہ وہ اجین ڈگری کالج میں لیکچرار ہوگیا ہے تو وہ بے حد خوش ہوا۔ اگلے دن اتوار تھا وہ صبح ہی مبارکباد دینے اس کے گھر پہنچ گیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ باہر نکل گئے اور گھومتے گھومتے وہ اندور جانے والی سڑک پر ہو لئے۔ صبح کے دس بجے تھے اور موسم خوشگوار تھا۔ اسی سڑک پر عیسائیوں کا گرجا تھا۔ راستے میں انہیں کئی عیسائی کنبے اچھی اچھی پوشاک پہنے چرچ جاتے ہوئے ملے۔ وہ دونوں بھی چرچ کے دروازے کے پاس ایک طرف کو کھڑے ہو کر اندر جاتے ہوئے عیسائیوں کو دیکھنے

لگے۔ گرجے کا بڑا ہال جس کے تین طرف کھڑکیاں تھیں سڑک کے متوازی تھا اور وہ یہاں سے اس کا اندرونی حصہ صاف دیکھ سکتے تھے۔ رام اوتار یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اس ہال میں کسی سینما گھر کی طرح قطار در قطار کرسیاں لگی ہوئی تھیں اور لوگ اندر جا کر کرسیوں پر بیٹھتے جارہے تھے! اتنے میں چرچ کا ایک مہتمم ان کی طرف بڑھا اور ان سے قدرے جھک کر مخاطب ہوا۔

''میرے بیٹو! اندر آئیے۔''

''ہم تو یونہی کھڑے دیکھ رہے ہیں۔ ہم ہندو ہیں۔'' رام اوتار بولا

''گاڈ اور یسوع مسیح تو سب کے ہیں۔ بیٹھئے اور من کی شانتی پالیجیے۔''

اتنے میٹھے الفاظ اور من کی شانتی حاصل کرنے کا بلاوا! پہلے کرشن گوپال اور پھر رام اوتار نے قدم بڑھا دیئے۔ اندر تو ہلکی رفتار سے بجلی کے پنکھے بھی چل رہے تھے اور لوگ بڑی خاموشی سے بیٹھے تھے۔ وہ پیچھے کی دو خالی سیٹوں پر بیٹھ گئے۔ ان کے بیٹھنے کے کچھ منٹ بعد ہی ایک پادری نے کھڑے ہو کر ایک لمبی اور اسٹول نما میز پر سے جس پر مائک بھی لگا ہوا تھا بائبل کی تعلیمات پر روشنی ڈالی۔ سب لوگ ہمہ تن گوش ہو کر سن رہے تھے۔

وہ کوئی آدھ گھنٹے کے بعد گرجے سے نکلے۔ رام اوتار بولا۔

''یار مجھے عیسائیوں کی عبادت کا یہ طریقہ بڑا پسند آیا۔ آرام سے کرسیوں پر بیٹھو۔ ٹھنڈی ہوا کھاؤ۔ نہ شور شرابہ''

''شور وغل بھی عبادت یا جوشِ عقیدت کے اظہار کا طریقہ ہے اور تقریباً ہر مذہب میں، خاص طور پر وعظ یا اپدیش کے موقع پر یا جب مذہبی رسوم اجتماعی طور پر ادا کی جائیں۔''

''اچھا یہ بتا تیری جو کالج میں نوکری لگی ہے اس کے لیے تیرے پاس کوئی سفارش تھی؟'' رام اوتار نے بات کا رخ موڑ دیا۔

''سفارش حاصل کرنے کی پتا جی نے ضرور کوشش کی تھی۔ ہمارے محلے کے سب سے بڑے آدمی وہی جسٹس شفیق اللہ ہیں۔ مجھے لے کر ان کے پاس پہنچ گئے اور ان سے درخواست کی کہ اگر آپ پرنسپل یا مینجنگ کمیٹی کے کسی ممبر کو جانتے ہیں اور مناسب سمجھیں تو لڑکے کے بارے میں کہہ دیں۔ بولے کہ میں جانتا تو ان سب کو ہوں مگر سفارش اور رشوت کے ہمیشہ خلاف رہا ہوں اور اب ریٹائر ہو کر اس اصول کو توڑنا نہیں چاہتا۔ مگر میں بخوشی

برخوردار کو ایک سرٹیفیکیٹ دے سکتا ہوں جو کسی کے نام نہیں ہوگا اور نہ اس پر کوئی تاریخ ہوگی کیونکہ آپ کہتے ہیں کہ انٹرویو کل ہے۔ انہوں نے اپنا پیڈ لیا اور اس پر لکھ دیا کہ وہ مجھے کئی سالوں سے جانتے ہیں اور یہ کہ میں ایک قابل، دیانت دار اور بھروسے کے قابل نوجوان ہوں۔ اس سٹرفکیٹ کو میں نے اپنے دوسرے سرٹیفکٹوں کے ساتھ اپنی فائل میں رکھ لیا اور انٹرویو کے وقت جب مجھ سے اپنی سٹرفکیٹ دکھانے کو کہا گیا تو میں نے فائیل بڑھا دی۔ اب یہ کہنا مشکل ہے کہ جج صاحب کے سٹرفکیٹ کو کسی نے پڑھا بھی یا نہیں یا اس کا کیا اثر ہوا۔ بہر حال پتا جی میرے لیے جانے کے خبر انہیں دے آئے تھے اور ان کا شکریہ ادا کر آئے تھے۔''

کچھ دیر دونوں چپ چاپ چلتے رہے۔ خوشگوار ہوا کب کی بند ہوگئی تھی اور دھوپ میں اب تیزی تھی۔ دونوں نے ادھر اُدھر دیکھا مگر کوئی رکشا نظر نہیں آیا جو بازار تک کر لیتے۔ ویسے بھی رام اوتار کا گھر اب دور نہیں تھا اور کرشن گوپال چاہے گا تو وہاں سے اپنے گھر تک کے لیے رکشا کر لے گا۔ گوپال نے بات پھر شروع کی۔

''رام اوتار یہ جسٹس شفیق اللہ بہت ہی عمدہ اور سلجھے ہوئے انسان ہیں۔ اپنے مذہب کے بہت پابند ہیں مگر مذہب کی بنا پر تعصب یا تمیز میں یقین نہیں رکھتے۔ کہتے ہیں مذہب انسان کا نجی معاملہ ہے اور اس دنیا میں سماجی سطح پر جہاں تک انصاف، رحم اور مدد کا تعلق ہے، تمام انسان ایک ہیں۔ پچھلے روز جب ہم اُن سے ملے تھے تو انہوں نے ایک کمال کی بات کہی تھی کہ مذہب کے بغیر انسان نامکمل ہے اور مذہب ہی حیاتِ انسانی کا محور ہے۔''

بات بڑی پیچیدہ سی ہوگئی تھی اور رام اوتار کی سمجھ میں کچھ آیا، کچھ نہیں۔ مگر اتنا وہ ضرور سمجھ گیا تھا کہ مذہب نفرت نہیں محبت کا درس دیتا ہے۔ رام اوتار کا گھر آ گیا تو اس نے کرشن گوپال کو بھی اندر آنے اور ناشتہ کر کے جانے کو کہا۔ مگر کرشن گوپال کو کچھ کام تھا اور اس نے معذرت چاہی۔ ایک رکشا کو روک کر اور اس میں بیٹھ کر وہ اپنے گھر کی طرف چل پڑا۔

کھوئے ہوئے گھر

شام کے دھند لکے میں، تنگ گلی میں گھس کر، جب جے رتن نے اپنے ایک کمرے کے مکان کے باہر خالی ٹین کے ڈبوں کوٹھوکر مار کر پرے کیا، تو اس کے دروازے پر سویا ہوا، گلی کا ایک کتا خود ہی بھاگ گیا۔ اس نے تالہ کھولا اور اندر داخل ہو کر بجلی کا سوچ آن کیا تو کمرے میں ایک بے جان سی زرد روشنی پھیل گئی۔ کمرے کی واحد پیچھے کی طرف دوسری گلی میں کھلنے والی کھڑکی پہلے ہی سے کھلی تھی مگر ہوا نام کو بھی نہیں تھی جے رتن نے ایک بوسیدہ سی میز پر رکھا ہوا بہت پرانا اور شور مچانے والا بلکہ زور سے روں روں کرنے والا بجلی کا پنکھا چلا دیا اور اپنے لوہے کے فولڈنگ بیڈ کو گھسیٹ کر اُس کی زد میں بیٹھ گیا۔ اُس نے بغیر جھکے اور ہاتھوں کا استعمال کیے، ایڑیوں کو فرش پر رگڑ کر اور زور لگا کر اپنے جوتے نکالے اور بے زاری میں دور پھینک دیئے۔ وہ بیڈ پر لیٹ گیا اور اپنی جیب میں سے سگرٹ نکال کر اور اُسے سلگا کر چھت پر ایک دوسرے سے تقریباً ملی ہوئیں دو موٹی چھپکلیوں کو دیکھنے لگا۔

جے رتن تقریباً پچاس سال کا ہوگا۔ دراصل اس کو اپنی صحیح عمر معلوم نہیں تھی کیونکہ اُس کے گھر والوں نے کبھی اُس کی تاریخِ پیدائش اُسے نہیں بتائی تھی۔ اس کے اپنے وطن ہندوستان میں اس وقت کی بمبئی کی ایک دور دراز کی جھونپڑ پٹی کے اسکول میں اُس کا داخلہ اُس کی تاریخ پیدائش کی بنا پر ہوا تھا یا گھر والوں کی بتائی ہوئی عمر پر۔ اِس کا بھی اُسے کچھ پتہ نہیں تھا۔ وہ اُس اسکول میں دو تین جماعت تک پڑھا ہوگا۔ بمبئی میں اس کا باپ بہت دارو پیتا تھا اور اس کو اور اس کی ماں کو بے دردی سے مارتا تھا۔ ایک رات دارو پینے کے بعد اُس

نے اتنی الٹیاں کی تھیں کہ اگلی صبح اپنی چار پائی پر مرا ہوا ملا تھا۔اس کے مرنے پر جے رتن اپنی ماں کے ساتھ لپٹ کر بہت رویا تھا۔اس کے کوئی ایک ماہ بعد اُس کے چاچا گنپت نے جو بوری بندر میں مزدوری کرتا تھا برازیل ہجرت کرنے کی ٹھان لی۔اُس نے جے رتن کی ماں کو یہ کہہ کر کہ دوسرے ملکوں میں لوگ خوب کماتے ہیں، جے رتن کو بھی اپنے ساتھ لیجانے کے لیے اس کی رضا مندی حاصل کرلی۔ یہ سفر اور ہجرت غیر قانونی طور پر بغیر کسی دستاویز یا کاغذات کے کی جانی تھی۔گنپت غیر شادی شدہ تھا اور اُس کی کوئی خانگی ذمے داری نہیں تھی۔وہ بندرگاہ میں کام کرنے والے کچھ آدمیوں کی مدد سے ایک غیر ملکی مال بردار جہاز پر جو بمبئی میں لنگر انداز تھا اور جنوبی امریکہ جارہا تھا مزدور کے طور پر بھرتی ہوگیا اور جے رتن کو بھی اپنے ساتھ سوار کرالیا۔وہ کوئی ڈیڑھ ماہ کے طویل اور پرصعوبت سمندری سفر کے بعد برازیل کے ساحل کے قریب پہنچے تھے۔جب جہاز خراب موسم کے سبب رات کے وقت ایک گمنام بندرگاہ میں رکا تو یہ دونوں چوری سے ساحل پر اتر پڑے تھے۔رات کی تاریکی میں، وہ دو تین گھنٹے پیدل چلنے کے بعد ایک قصبے ڈولائی میں پہنچ گئے تھے اور اس وقت سے آج تک یہی قصبہ جے رتن کا گھر اور اس کا وطن تھا۔جب جے رتن اس ملک برازیل میں داخل ہوا تھا تو وہ اپنے چاچا کے مطابق پندرہ سال کا تھا۔

جہاں تک برازیل کے دارالخلافے اور کئی بڑے شہروں کا تعلق تھا اُن میں تو ہندوستانیوں کی ایک بڑی تعداد آباد تھی۔ یہ ہندوستانی اچھی ملازمتوں میں تھے یا اپنا کاروبار کررہے تھے۔مگر ڈولائی تو بہت چھوٹا اور پچھڑا ہوا شہر تھا جہاں ملازمت پانے یا کوئی اپنا کام کرنے کے مواقع بہت کم تھے۔اس کی آبادی بھی پچاس ہزار سے زیادہ نہیں تھی اور دور دور تک بکھری ہوئی تھی۔سمندر کا ایک کٹا ہوا ٹکڑا اس کے کناروں پر بھی بہتا تھا۔یہاں دو تین چھوٹے ہوٹل تھے جن میں سیاح آکر ٹھہر جاتے تھے۔شہر میں غریب اور نادار لوگوں کی بہتات تھی۔ ہندوستانی گھر صرف تین تھے۔ایک گنپت اور جے رتن پر مشتمل۔دوسرا پورن سنگھ جو گنپت کے آتے ہی اس کا دوست بن گیا تھا اور جس نے انہیں یہ کمرہ کرایے پر دلوانے میں مدد کی تھی اور جو اس بستی کی چوتھی گلی میں رہتا تھا اور تیرا پورن سنگھ کی اطلاع کے مطابق ایک گندی بستی میں کافی دور رہتا تھا اور بہت کم ادھر آتا تھا۔صرف ایک بار اس کی ملاقات پورن سنگھ سے ایک شراب کی دکان پر ہوئی تھی۔ پورن سنگھ گنپت کی ہی عمر کا تھا۔وہ

ایک دکان میں چھوٹا ملازم تھا اور اس نے ایک مقامی عورت سے شادی کر رکھی تھی اور اس کے چار لڑکے تھے۔

برازیل کے چھوٹے شہروں اور دیہات میں زندگی ہندوستان کی زندگی سے زیادہ مختلف نہیں تھی۔ دونوں ملکوں کے لوگوں میں رنگ، خدوخال اور خصائل کے لحاظ سے بھی زیادہ فرق نہیں تھا۔ گنپت نے یہاں آنے کے کوئی دس سال بعد پینتالیس سال کی عمر میں اپنے سے پانچ سال بڑی ایک مقامی عورت سے شادی کر لی تھی مگر کچھ مہینوں بعد ہی اس کا بڑا بیٹا گاؤں سے آیا اور گنپت سے جھگڑا کر کے اُسے اپنے ساتھ لے گیا۔ دو سال بعد گنپت ایک دوسری عورت کو گھر لے آیا۔ وہ گھروں میں کام کرنے والی ایک جوان اور مضبوط جسم کی تیز اور طرار عورت تھی۔ وہ گنپت کے مقابلے میں جے رتن پر آنکھ رکھتی تھی جو اب چھبیس ستائیس سال کا بانکا اور طویل قامت نوجوان تھا۔ مگر جے رتن کی بے رخی کو دیکھ کر وہ اس کو گھر سے نکالنے کی ضد کرنے لگی۔ جب گنپت نے اس کی بات اور جے رتن پر لگائے ہوئے اس کے الزامات کو ماننے سے سامنے انکار کر دیا تو وہ اس سے بات بات پر جھگڑنے لگی۔ پہلے تو گنپت کو شراب پینے پر اکساتی مگر جب وہ نشے میں دھت ہو جاتا تو اُسے بیلن اور جھاڑو سے مارتی اور اُس کی جیب میں سے پیسے نکال لیتی۔ جے رتن صبح ہی کام پر چلا جاتا تھا اور رات کو بہت دیر سے صرف سونے کے لیے آتا تھا۔

ایک روز جے رتن کی غیر حاضری میں گنپت اور اس کی بیوی کی خوب لڑائی اور مار پیٹ ہوئی اور لوگ بھی اکٹھے ہو گئے۔ لوگوں نے قدرتی طور پر اپنے ملک کی عورت کی حمایت کی اور ایک آدمی نے تو گنپت کے ایک دو ہاتھ جڑ دیئے اور عورت کو اکسایا کہ پولیس اسٹیشن جا کر رپورٹ کر دے۔ اگلے دن گنپت کی غیر حاضری میں وہ عورت ایک چادر میں گھر کا کافی سامان کپڑے اور برتن باندھ کر رفو چکر ہو گئی۔ اس واقعے کے کوئی دو سال بعد گنپت نے ایک رات کھانستے کھانستے دم توڑ دیا۔ جے رتن ہر لحاظ سے بڑا پریشان ہوا اور دو تین دن کام پر بھی نہیں گیا۔

جے رتن نے اپنے چاچا کے ساتھ یہاں آ کر ان گنت بار ایک نوکری چھوڑ کر دوسری کی تھی۔ یہ شہر عام آدمی کے لیے ملازمت اور اخراجات کے لحاظ سے بڑا خراب تھا۔ دونوں نے یہاں غیر معمولی دشواریوں کا سامنا کیا تھا۔ جے رتن کو کوئی دو سال سے ایک اچھا

کام مل گیا تھا اور وہ اس شہر کے واحد بینڈ کے ساتھ تھا۔ یہاں کے کچھ سازندوں نے ایک بینڈ بنا رکھا جو ہر روز شام کو از خود ساحلی سمندر پر اپنے سازوں اور ڈھیلی ڈھالی نیلے رنگ کی وردیوں میں پھلوں کی پھینکی ہوئی پیٹیوں کو الٹا کر کے ان پر بیٹھ جاتا تھا اور رات کے گیارہ بارہ بجے تک دھنیں بجاتا رہتا تھا۔ بینڈ ماسٹر یعنی اس کا مالک ایک مسٹر ریالٹو تھا جو ایک گنجے دار شریف آدمی تھا اور جمعے کے جمعے ہر باجے والے کو ایک مقررہ تنخواہ دیتا تھا۔ تنخواہ ٹھیک ہوتی تھی مگر اس کی یہ شرط ہوتی تھی کہ وہ اپنے باجے والوں کو کام پر صبح آٹھ بجے سے رات کے بارہ بجے تک جب چاہے بلوا سکتا تھا۔ جے رتن کو شروع سے گانے کا شوق تھا اور بنسری تو وہ سات آٹھ سال کی عمر سے بجا رہا تھا اور اپنے ساتھ ایک بنسری یہاں بھی لے آیا تھا۔ جب وہ اس اجنبی اور بے روح شہر میں ملول خاطر ہوتا تو بنسری لے کر سمندر کے کنارے آجاتا اور کسی کونے میں ریت پر بیٹھ کر کچھ پرانی دھنیں بجانے لگتا۔ ایک ایسے ہی دن وہ اپنی بنسری ہاتھ میں لے کر اس بینڈ کی بھیڑ میں شامل ہو گیا اور پروگرام کے ختم ہونے پر جب بھیڑ چھٹی تو ریالٹو کی نظر جے رتن اور اس کی بنسری پر پڑ گئی۔ اس نے اسے اشارے سے بلا لیا۔ اس نے جے رتن سے بنسری پر دو تین ہندوستانی دھنیں سنیں اور اسے بینڈ میں ملازمت کی پیش کش کر دی۔ جے رتن بے کار تھا اور اتنی تنخواہ اُسے آج تک نہیں ملی تھی۔ اُس نے ہاں کر دی اور اُسی وقت سے بینڈ میں ملازم ہو گیا۔

جے رتن کو یہ نوکری بڑی اچھی لگی۔ اس نے چند ہی دنوں میں ان کا ایک اور ساز بھی سیکھ لیا اور ان کی دھنیں بھی بجانے لگا۔ وہ بینڈ کی دی ہوئی وردی بڑی خوشی سے پہنتا تھا اور دو مہینوں میں ہی وہ بینڈ کا ایک مقبول اور جانا پہچانا رکن بن گیا۔ پہلی مرتبہ اس نے زندگی میں ایک حقیقی مسرت کا احساس کیا تھا۔ اس نے دو بار پہلے بھی یہاں کی کسی عورت سے شادی کر کے اپنا گھر بسانے کی سوچی تھی مگر اسے صرف موٹی، بھدّی اور بد اخلاق... مائیں ہی مل سکتی تھیں اور وہ اپنے چاچا کے ساتھ گزرے ہوئے ہولناک تجربوں کو بھولا نہیں تھا۔ جب بھی وہ شادی کرنے کا فیصلہ کرتا تو اسے بمبئی کی نرم و نازک، شوخ اور ہنس مکھ لڑکیاں یاد آجاتیں اور وہ دل مسوس کر رہ جاتا۔

ایک روز دوپہر کو جب جے رتن اپنے کمرے میں خالی بیٹھا ہوا تھا تو پورن سنگھ آیا اور اس کے برابر کرسی پر بیٹھ کر بولا۔

''کل مجھے بمبئی کا ایک اور آدمی ادھر ملا۔ بڑی خراب حالت تھی اس کی اور دن میں بھی اس نے دارو پی رکھی تھی۔ اس نے اپنا نام پون کمار بتایا۔ کہتا تھا بمبئی میں اُسے ٹیٹو کہتے تھے۔ مجھ سے پوچھتا تھا کہ کوئی اور ہندوستانی بھی ادھر تھا۔ میں نے تمہارا ذکر کر دیا۔ تمہارے بارے میں اس نے بہت سی باتیں معلوم کیں اور پھر کہنے لگا کہ تم تو اس کے رشتے دار ہو۔ اپنے کو تمہارا موسی زاد بھائی بتاتا تھا۔''

جے رتن کچھ گھبرا سا گیا اور بولا۔

''چاچا تم نے اسے میرا پتہ تو نہیں بتادیا؟''

''اس نے پتہ مانگا تھا تو میں نے ایک پرچے پر لکھ کر اسے دیدیا۔ دو ایک دن میں تم سے یہاں ملنے آئے گا۔ مگر کیوں کیا وہ تمہارا رشتے دار نہیں ہے؟'' پورن سنگھ بولا

''ہے تو بھائی ہی مگر وہ مجھے ملا تو نقصان میرا ہی ہوگا۔''

تھوڑی دیر میں پورن سنگھ چلا گیا اور جے رتن فکر مند ہو کر ٹیٹو کے بارے میں سوچنے لگا۔ ٹیٹو واقعی اس کا موسی زاد بھائی تھا اور اس سے دو تین سال بڑا تھا۔ وہ اس وقت بھی بڑا طاقتور لمبا اور مضبوط جسم کا تھا اور بستی کے سب لڑکے اس سے ڈرتے تھے۔ وہ چھوٹی سی عمر میں ہی دارو پینے لگ گیا تھا اور بیڑی تو وہ بہت پہلے سے پیتا تھا۔ وہ دو تین سال اس کے اسکول میں اس کے ساتھ پڑھا بھی تھا مگر ایک لڑکے کو بری طرح پیٹنے اور دوسرے لڑکوں کے بستوں میں سے کتابیں چرانے اور انہیں فروخت کرنے کے الزام میں اسے اسکول سے نکال دیا گیا تھا۔ اس نے جے رتن کو بھی کئی دفعہ مارا تھا۔ قسمت کا یہ کتنا عجیب و غریب کھیل تھا کہ وہ ٹیٹو بھی اتنی دور جنوبی امریکہ میں اور برازیل میں ہی اور اسی شہر میں تھا! جب اس نے اور اس کے چاچا نے ہندوستان چھوڑا تھا تو ٹیٹو وہیں تھا۔ کن حالات میں اور کب وہ یہاں پہنچا تھا، یہ تو وہی بتا سکتا تھا۔ پورن سنگھ نے اُسے یہ بھی بتایا تھا کہ ٹیٹو جس بستی میں رہتا تھا وہ یہاں سے سات آٹھ کلو میٹر دور تھی اور ڈولائی کی سب سے گندی اور بدنام بستی تھی۔

ایک ہفتہ گزر گیا مگر ٹیٹو جے رتن کے پاس نہیں پہنچا۔ جے رتن نے سوچا کہ ٹیٹو سے اُس کے پتے کا پرچہ گم ہو گیا ہوگا اور اس نے اپنے ذہن سے ٹیٹو کا خیال نکال دیا۔ ایک روز جب اس کا بینڈ ایک ہوٹل میں اونچے سروں میں ایک کیف آور دھن بجا رہا تھا تو جے

رتن جوش اور مستی کے عالم میں وہیں کھڑا کھڑا اپنے جوتوں کو فرش پر مار کر ٹھپ ٹھپ کی آواز ایک ترنم میں نکالنے لگا جو دھن سے ہم آہنگ تھی اور ایسا لگا کہ کوئی والہانہ انداز میں رقص کر رہا ہو! ہوٹل کا منیجر اور بیٹھے ہوئے سب گاہک جھوم سے گئے۔ اُس رات بینڈ کی کارکردگی کی بڑی تعریف ہوئی۔ اگلے روز جمعہ تھا۔ ریالٹو نے جے رتن کو تنخواہ کے علاوہ لکڑی کی ایڑیوں کے جوتے خریدنے کے لیے بھی پیسے دیئے اور بولا۔

''دو تین دن میں ہی کیپیٹل شومارٹ سے یہ جوتے خرید لینا۔ ہمیں منگل کو رِٹز ہوٹل میں شوکرنا ہے۔ آج سے تم فلوٹ بجانے کے علاوہ اپنے دونوں پاؤں سے فرش پر رقص کی دھن بھی نکالو گے۔ میں تمہارے لیے کل لکڑی کی ایک بڑی چوکی بھی بنوا رہا ہوں جس پر تم کھڑے ہو گے۔''

جے رتن سوموار کو کوئی پانچ بجے کے قریب جب شام کی خنکی ابھی شروع بھی نہیں ہوئی تھی کیپیٹل شومارٹ پہنچ گیا اور اس نے وہاں درجنوں لکڑی کی ایڑی کے جوتے دیکھ کر اپنی پسند کا اور دی ہوئی رقم کے اندر ایک جوڑا خرید لیا۔ جوتوں کے ڈبے کو وہ اپنی بغل میں دبا کر اور دکان سے نکل کر پٹڑی پر دو چار قدم ہی چلا ہو گا کہ اس نے سامنے سے آتے ہوئے ٹیٹو کو عین اپنے بالمقابل پایا! دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر ٹھٹھک کر رہ گئے۔ پینتیس سال سے زیادہ کے طویل وقفے نے دونوں کے خدوخال کے بنیادی اجزا کو ابھی نہیں مٹایا تھا۔ ٹیٹو کا ڈیل ڈول ویسا ہی تھا بلکہ وہ زیادہ موٹا ہو گیا تھا۔ قد جے رتن سے بھی ایک دو انچ نکلا ہوا تھا۔ اس کے کپڑے بوسیدہ اور گندے تھے۔ اس کی آنکھیں سرخی مائل اور گدلی تھیں۔ اس نے جے رتن کا گھر کا نام ''گلو'' لے کر اُسے اپنی بانہوں میں بھر لیا اور جھنجھوڑ کر بولا۔

''چل میرے گھر چل۔ میرے بچپن کے دوست اور بھائی جب مجھے کسی نے بتایا کہ تو بھی یہاں ہے اس دن سے میں تیری تلاش میں مارا مارا پھر رہا ہوں۔ آج قدرت نے ملا دیا۔ چل اپنی بھابی سے بھی مل۔''

جے رتن نے بھی رسمی خوشی کا اظہار کیا۔ یوں بھی ابھی اس کا خون سرد نہیں ہوا تھا اور ٹیٹو اس کی سگی موسی کا لڑکا تھا۔ وہ ٹیٹو کے ساتھ ہو لیا اور راستے میں ٹیٹو اپنی رام کہانی سناتا رہا۔ ایک دارو کی دکان کے سامنے ٹیٹو رک گیا اور جے رتن سے بولا۔

''آج کا دن میرے لیے بڑی خوش قسمتی کا دن ہے کہ تو مجھے مل گیا۔ چل اس

دکان سے دو بوتل دارو لیتے ہیں تیرے پاس پیسے تو ہوں گے تو دے دے۔ گھر جا کر لوٹا دوں گا۔ رات کا کھانا تو میرے ساتھ کھائے گا اور سوئے گا بھی میرے ساتھ۔ کل صبح میں تیرے ساتھ تیرے گھر چلوں گا۔''

''لیکن میں شراب نہیں پیتا۔'' جے رتن بولا

''تو تو نہ پیو۔ مگر میں تو پیتا ہوں۔ پیسے تو ہیں نا تیرے پاس۔''

''ہاں پیسے تو ہیں۔''

دونوں دکان میں گئے۔ ٹیٹو نے دو بوتلیں خریدیں اور جے رتن سے پیسے دلوا دیئے۔ بوتلیں ایک پلاسٹک کے تھیلے میں ڈلوا کر ٹیٹو جے رتن کے ساتھ باہر نکل آیا۔

یہ ایک بہت گندی بستی تھی۔ ٹیڑھے میڑھے تنگ اور کچے راستے، بوسیدہ لکڑی اور ٹین کے ٹکڑوں کے گھروندوں کی کبھی نہ ختم ہونے والی دورویہ قطاریں۔ گلیوں میں جگہ جگہ بیٹھے ہوئے، سوئے ہوئے یا لڑتے ہوئے لاتعداد کتے۔ دونوں طرف کھلی اور چوڑی نالیوں میں بہتا ہوا گندہ پانی اور ان پر منڈلاتے ہوئے مچھر، چیتھڑوں میں لپٹے ہوئے اور چیختے چلاتے بچے، موٹی بھدی سیاہ فام عورتیں یا بید سے بھی زیادہ دبلی پتلی جوان مگر کشش سے عاری لڑکیاں اور اپنے اپنے دروازوں پر بیٹھے ہوئے، یا باہر گلیوں میں کھانستے ہوئے اور تمباکو پیتے ہوئے جوان اور بوڑھے۔

'' چلے آؤ'' ٹیٹو تیزی سے قدم بڑھاتا ہوا بولا '' بس اب گھر آ گیا۔ صرف دو گلیاں اور پار کرنی ہیں'' جے رتن ایک انجانے خوف اور گھبراہٹ کے عالم میں اپنے جوتوں کی جوڑی بغل میں دبائے چلتا رہا۔ پھر ایک نہایت تنگ اور بوسیدہ جھونپڑی نما مکان کے سامنے رک کر ٹیٹو نے زور سے اس کے لکڑی کے دروازے کو لات مار کر کھولا اور بولا۔

'' آ جاؤ یہی میرا مکان ہے۔''

جے رتن ٹیٹو کے پیچھے اندر اندھیرے میں لڑکھڑایا۔ یہ کمرہ نہیں ڈیوڑھی سی تھی۔ اس سے ملا ہوا ایک نہایت چھوٹا کمرہ اور اس میں سے ایک تین چار فٹ کا دروازہ اندر کھلتا ہوا جو ظاہر کرتا تھا کہ پیچھے بھی کوئی کوٹھڑی تھی۔ ٹیٹو نے جیب میں سے ماچس نکال کر مٹی کے تیل کا ایک چراغ روشن کر دیا جس نے دیواروں پر بڑی ہیبتناک تصویریں بنا دیں۔ ٹیٹو نے بوتلیں لفافے میں سے نکال کر ایک چھوٹی سی لکڑی کی میز پر رکھیں جس کے پاس لوہے کی

دو زنگ آلود کرسیاں رکھی تھیں اور آلے میں سے کنچ کے دو گلاس اٹھا کر میز پر رکھتا ہوا بولا۔

''آرام سے بیٹھ اس کرسی پر۔ یہ تیرا اپنا گھر ہے۔''

اور پھر ٹیٹو مقامی بولی میں زور سے چلایا۔

''ماریا کیا ابھی تک سوئی پڑی ہے؟ اُٹھ دیکھ کون آیا ہے۔''

اندر کی کوٹھڑی سے دو نیکر اور بنیان پہنے تیرہ، چودہ سال کے لڑکے تیزی سے نکلے اور یہ کہہ کر کہ ماں ابھی آتی ہے باہر کی طرف بھاگنے لگے مگر ٹیٹو انہیں روک کر بولا۔

''ابے کبھی گھر پر بھی بیٹھا کرو۔ دیکھو یہ تمہارے چاچا ہیں ہندوستانی....''

''چاچا سلام''۔ بڑا لڑکا بولا اور دونوں باہر بھاگ گئے۔ ایک ادھیڑ عمر کی بدصورت اور بے حد کمزور عورت نکلی اور اس نے ایک ٹوکری میں سے ایک پیاز اور ایک ٹماٹر نکالا اور انہیں کاٹ کر ایک پلیٹ میں بوتلوں کے پاس رکھ دیا۔ اس نے جے رتن کی طرف دیکھا بھی نہیں۔ اس کا چہرہ بلکہ سارا جسم سویا ہوا سا تھا اور ایسا لگتا تھا کہ اُسے دنیا کی کسی چیز میں دلچسپی نہیں تھی اور وہ شاید موت کی منتظر تھی۔ وہ اندر واپس جانے لگی تو ٹیٹو نے اسے پھر آواز دی۔

''یہ میرا بھائی گلو ہے۔ تیرا ہندوستانی دیور۔ یہ بھی یہیں رہتا ہے۔ آج اتفاق سے مل گیا تو میں اسے یہاں لے آیا۔ یہ بوتلیں اس نے اپنے پیسوں سے مجھے دلوائی ہیں۔ بھائی جو ہے میرا۔''

ماریا نے جے رتن کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا اور اندر چلی گئی۔ اس کے بعد اس کے کبھی کبھی زور سے کھانسنے کی آواز آتی رہی۔ ٹیٹو اس اثنا میں ایک بوتل کھول کر ایک گلاس پی چکا تھا۔ اس نے دوسرا گلاس بھرا، ٹماٹر کا ایک ٹکڑا پیاز کے ایک ٹکڑے سے جوڑ کر منہ میں ڈالا اور پلیٹ جے رتن کے آگے کر کے بولا۔

''لے کھا۔ میں تو کہتا ہوں ایک گلاس دارو بھی پی لے۔ اگر دارو نہ ہوتی تو قسم سے یہ دنیا ختم ہو جاتی۔''

ٹیٹو دوسرا گلاس ختم کر کے تیسرا بھر چکا تھا اور ایک لیٹر کی بوتل خالی ہو گئی تھی۔ جے رتن کی طرف منہ کر کے بولا۔

''میری ایک بات دھیان سے سن۔ تیرے پاس اگر پیسہ ہے تو میرے ساتھ مل

کر بزنس کر۔ مالا مال ہو جائے گا۔ میرے پاس لاجواب اسکیمیں ہیں۔''

یہ کہہ کر ٹیٹو نے سارا گلاس ایک ہی دفعہ میں منہ میں اُنڈیل لیا اور دوسری بوتل کو ہاتھ بڑھا کر آگے کر لیا۔ ایک منٹ کے وقفے کے بعد پھر بولا۔

''تیری جیب میں کوئی سگریٹ یا سگار ہو تو دے۔''

جے رتن نے اپنی جیب میں سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا اور ایک سگریٹ ٹیٹو نے نکال لی اور ایک جے رتن نے لے لی۔ پھر جے رتن نے اپنا لائٹر نکال کر پہلے ٹیٹو کی اور پھر اپنی سگریٹ سلگائی۔ ٹیٹو ایک لمبا کش لگا کر بولا۔

''ایک بات تیرے کو بتا دوں۔ میرے اور تیرے سارے رشتے دار ہندوستان میں مر چکے ہیں۔ کبھی تو کسی کے لیے دولت جوڑ رہا ہو۔''

ٹیٹو دوسری بوتل بھی کھول چکا تھا۔ مگر وہ پہلے ہی سے بہت نشے میں تھا اور اس کی آنکھیں چڑھی ہوئی تھیں۔ جے رتن بولا۔

''ٹیٹو میرے پاس پیسہ کہاں ہے۔ میں نے اب تک اس اجنبی ملک میں بڑی غربت کی زندگی بسر کی ہے اور اس دن کو کوستا رہا ہوں جب میں نے گپت چاچا کے ساتھ اپنا وطن ہندوستان چھوڑا تھا۔ میں تو شادی بھی نہیں کر سکا۔''

''ہت تیری کی'' ٹیٹو بے زاری سے بولا ''ابے ہم اپنے ملک میں بھی ایسے ہی مرتے جیسے یہاں مریں گے۔ وہاں ہماری اور ہمارے ماں باپ کی حالت کون سی اچھی تھی۔ رہی بات تیری شادی کی تو بنا لے اپنی شادی ابھی، اسی وقت۔ میرے پڑوس میں ایک بڑی پٹاخہ لڑکی رہتی ہے۔ جوان ہے، کنواری ہے۔ ابے لیکن میں تجھے جانتا ہوں۔ تیرے پاس پیسہ تو بہت ہے مگر تو کنجوس مکھی چوس ہے۔ میں نے تیرے بھلے کی بات کی تھی کہ لگا دے پیسے میرے ساتھ بزنس میں۔ ابے لاکھوں کمائے گا، لاکھوں۔ ورنہ بے آئی موت مرے گا۔ بتا دیتا ہوں تجھے۔''

اور ٹیٹو ایک اور گلاس شراب کا غٹا غٹ پی گیا۔ اس کے بعد وہ کچھ بے قابو سا ہو گیا۔ وہ اپنی بیوی ماریا کو گندی گالیاں دینے لگا اور اپنے بچوں کو ناجائز اولاد اور حرام کے پلّے بتانے لگا۔ ایک مرتبہ اس نے غصے میں اتنے زور کا ہاتھ ہوا میں مارا کہ اگر جے رتن سنبھل کر نہ بیٹھا ہوتا تو شاید وہ زمین پر گر پڑتا۔ ٹیٹو نے اپنا سر میز پر رکھ دیا اور واہی

تباہی بکنے لگا۔ پھر وہ دھیرے دھیرے بڑبڑانے لگا اور کچھ ہی لمحوں میں خاموش ہو گیا جیسے سو گیا ہو۔ جے رتن اُٹھ کر کھسک جانے کی ہی سوچ رہا تھا کہ اندر سے ماریا نکلی اور مقامی زبان میں بولی۔

''تم جاؤ۔ یہ اسی طرح دارو پیتا ہوا کسی دن مر جائے گا۔ شاید آج ہی مر جائے۔ اگر تم پیتے رہے تو پولیس تم پر الزام لگا کر تمہیں پکڑ کر لے جائے گی۔ جاؤ۔''

یہ کہہ کر ماریا نے ٹماٹر اور پیاز والی پلیٹ اٹھائی اور اندر لے گئی۔ جے رتن نے اپنا ڈبہ اُٹھا کر بغل میں دبایا اور ملگجی روشنی اور اندھیرے میں سے ہوتا ہوا باہر گلی میں نکل آیا۔ گلی اندھیرے میں لپٹی پڑی تھی مگر گھروں میں بجھی بجھی سی روشنیاں جل رہی تھیں۔ مگر چہل پہل میں کوئی کمی نہیں تھی بلکہ زندگی زیادہ توانائی کے ساتھ اچھل پڑی تھی۔ ہر طرف مردوں اور عورتوں کی بھیڑ لگی تھی مگر جوان عورتوں کی تعداد کہیں زیادہ تھی اور انہوں نے بھاری وحشت انگیز میک اپ اپنے چہروں پر تھوپ رکھا تھا۔ سارا منظر ہنگامہ خیز مگر پراسرار تھا۔

جے رتن تیزی سے اس بستی سے نکل گیا۔ باہر کھلی سڑک پر آ کر اُس نے ایک خالی شہر جاتی ہوئی سامان بردار سائیکل رکشا کو روکا اور کرایہ طے کر کے پیچھے بیٹھ گیا۔ مارکیٹ میں اتر کر وہ گھر نہیں گیا بلکہ سمندر کے ساحل کی طرف مڑ گیا۔ وہاں پہنچ کر اس نے اپنے جوتوں کے ڈبے کو سر کے نیچے تکیہ بنا کر، رکھا اور ٹھنڈی ریت پر ٹانگیں پسار کر لیٹ گیا۔ اگر چہ چاندنی رات نہیں تھی مگر سمندر کی لہروں میں غضب کا تلاطم اور اضطراب تھا اور مچلتی اور اٹھتی لہروں کا شور اس کے ذہن میں ایک ہیجان پیدا کر رہا تھا۔ ایسے میں بے ساختہ اسے بمبئی میں اپنی بستی اور اپنے رشتے داروں کے گھر یاد آ گئے جنہیں وہ کبھی کا کھو چکا تھا اور وہ بہت مضمحل اور اداس ہو گیا۔ وہ یونہی پڑا رہا اور جب رات زیادہ ہو گئی تو وہ تھکے ہوئے قدموں سے اپنے خالی اور اجاڑ مکان کی طرف بڑھنے لگا!

فاختائیں

سیف خاں کوئی اٹھاون سال کا ہوگا مگر دیکھنے میں پچاس سے زیادہ کا نہیں لگتا تھا۔ فربہ، گول، سرخ وسفید حسین چہرہ، عقابی چمکدار آنکھیں، گھنے، گھنگریالے، بے سنورے بال جن میں کہیں کہیں سفیدی کا چھینٹا۔ طاقتور، سیدھا اور لمبا جسم۔ عموماً بے داغ، براق، سفید کرتے اور پاجامے میں رہتا۔ کہیں دور جانا ہوتا تو پاؤں میں بے تسمے کی گرگابی ڈال لیتا، ورنہ ربڑ کی عام، مگر عمدہ ساخت کی چپل پہنے رہتا۔ کام وہ اب کچھ نہیں کرتا تھا اور اس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ لاکھوں روپیہ پاس تھا اور کئی لاکھ روپے ادھر اُدھر دکانوں میں لگا رکھے تھے اور ان کے منافعے میں اس کا بھی حصہ تھا۔ ہاں گھومنے پھرنے کا شوق تھا۔ صبح دس گیارہ بجے اپنی کھٹارا، پرانے ماڈل کی فی۔ ایٹ گاڑی میں نکل جاتا اور پھر شام کو ہی لوٹتا۔

سیف خاں اپنے آپ کو پٹھان نسل کا، پشاور کے پاس چارسدّہ کا رہنے والا بتاتا تھا اور یقیناً ہوگا کیونکہ گھر والوں کا سرخ وسفید رنگ اور ان کے نمایاں اور خوشنما خدوخال دیکھنے والوں کو پہلی ہی نظر میں کھینچ لیتے تھے۔ بیوی، خانم، اگرچہ پچاس کی ہوگی مگر حسن کی ڈلی تھی۔ یہی حال تینوں لڑکیوں، نغمہ، شگفتہ اور شبنم کا تھا۔ لڑکا اللہ نے نہیں دیا تھا۔ شادی ابھی کسی لڑکی کی نہیں ہوئی تھی، اگرچہ تینوں جوان تھیں۔ نغمہ اٹھائیس سال کی، شگفتہ چوبیس کی اور شبنم بیس کی تھی۔ کوئی بھی لڑکی کہیں کام نہیں کرتی تھی۔ تینوں نے باندرہ کے اسلامیہ گرلز ہائی اسکول سے میٹرک پاس کیا تھا۔ کیونکہ سیف خاں اور خانم، بمبئی جیسے شہر میں، لڑکیوں کو اعلیٰ تعلیم دینے کے خلاف تھے، اس لیے کوئی لڑکی کالج نہیں گئی تھی۔ وہ

اپنے آپ کو گھر کے کام کاج میں یا ایک دوسرے سے بات کرنے میں مصروف رکھتی تھیں۔ ٹی۔وی دیکھنے کا بھی شوق تھا اور میوزک سسٹم سے گانے تو ہروقت چلتے رہتے تھے۔لڑکیوں کا باہر آنا جانا بہت کم تھا اور عموماً رشتے داروں تک محدود تھا۔ یا کبھی کوئی خریداری کرنی ہوتی تو چلی جاتیں۔تینوں لڑکیاں شاید اکٹھی کبھی نہ نکلی ہوں۔

سیف خاں شروع سے فلموں سے وابستہ رہا تھا۔شاید اس وجہ سے، یا اپنے ذاتی عقیدے کی بنا پر، وہ پردے کا حامی نہیں تھا اور نہ کبھی خانم کو برقعہ پہننے دیا اور نہ لڑکیوں کو۔ اس لیے گھر میں کبھی برقعہ خریدا ہی نہیں گیا، نہ سلوایا گیا۔صرف خانم کے دو پرانے گھر سے لائے ہوئے ریشمی برقعے تھے جو مدت سے پرانے ملبوسات کی ایک بڑی پیٹی میں بند تھے۔سیف خاں کہا کرتا تھا کہ پردہ تو آنکھ کا ہوتا ہے، وہ برقعہ کس کام کا کہ باہر نکلتے ہی پورا منہ کھول لیا!

سیف خاں کبھی فلموں کے لیے مکالمے لکھتا تھا مگر اس میں اُسے خاطر خواہ آمدنی نہیں ہوئی۔ پھر ایکسٹرا اداکاروں اور اداکاراؤں کی سپلائی کا کام کرنے لگا۔اس میں آمدنی تو ٹھیک تھی مگر کھولیوں اور جھونپڑپٹیوں میں رہنے والے گندے اور خراب لوگوں سے واسطہ پڑتا تھا اور اُسے جلد ہی محسوس ہو گیا کہ یہ کام ان لوگوں کے لیے زیادہ مناسب تھا جو ہاتھا پائی اور گالی گلوچ کر سکتے تھے۔اس لیے یہ کام بھی بند کر دیا۔ پھر فلموں کی آؤٹ ڈور شوٹنگ کے موقعوں پر خیمے، کرسیاں اور دوسرے ساز و سامان کی سپلائی کے ٹھیکے لینے شروع کر دیئے۔یہ کام اس نے ایک میاں بنے خاں کی شراکت میں کیا تھا اور اس کی بے ایمانی کی وجہ سے اس میں گھاٹا ہو گیا اور اسے بھی چھوڑنا پڑا۔ چونکہ فلم انڈسٹری سے شروع سے جڑا رہا تھا، گھر میں فلم سے تعلق رکھنے والوں کا آنا جانا بھی لگا رہتا تھا۔ایک روز ایک اداکار اسلم کی نغمہ پر نظر پڑ گئی اور وہ اس پر فریفتہ ہو گیا۔اس نے کسی کے ذریعے نغمہ کے لیے پیغام بھجوایا مگر سیف خاں اور خانم دونوں نے ہی صاف انکار کر دیا۔ایک تو اسلم کے آگے پیچھے کا کسی کو کچھ پتہ نہیں تھا، دوسرے سیف خاں جانتا تھا کہ اسلم جیسا اداکار آج نہیں تو کل بھوکا مرے گا۔ پھر سیف خاں ان لوگوں کے چال چلن سے بھی واقف تھا۔سیف خاں اگرچہ خود فلموں سے وابستہ رہا تھا مگر اس نے ہر طرح سے اپنے آپ کو بچا کر رکھا تھا۔ وہ اپنے کردار کا پکّا تھا۔ شراب پینا چاہتا تو مفت میں ہی جتنی چاہے پی سکتا تھا، مگر کبھی اس موذی شے کے ہاتھ نہیں

لگایا اور اس بات کو ہمیشہ یاد رکھا کہ گھر میں تین تین لڑکیاں ہیں۔ ہاں روزے نماز کا پابند نہ ہوسکا کیونکہ اس کے کام کی نوعیت ہی کچھ اس قسم کی تھی۔ مگر جمعہ کی نماز، کہیں بھی ہو، قریبی مسجد میں جا کر پڑھنا کبھی نہیں بھولا۔ مگر گھر میں خانم اور لڑکیاں حتی الوسع اپنے تمام مذہبی فرائض کو پورا کرتی تھیں۔

اپنے آخری کام میں گھاٹے کے بعد سیف خاں نے فلمی دنیا کو خیر باد کہہ کر ملاڈ میں ایک دو بیڈروم کا فلیٹ خرید لیا اور یہیں سے پیسوں کے معاملے میں اُس کی قسمت کھل گئی۔ یہ فلیٹ شروع میں دو لاکھ روپے دے کر قسطوں میں مل گیا تھا مگر جب تک قسطیں پوری ہوئیں، اس فلیٹ کے دام ڈھائی گنے ہو گئے۔ کوئی چھ کلومیٹر پرے ایک نئی آبادی میں اسی قسم کا فلیٹ، اُسی پرانی قیمت پر مل رہا تھا۔ سیف خاں نے یہ فلیٹ بیچا اور نیا فلیٹ خرید کر وہاں منتقل ہو گیا۔ اس سودے میں اسے پورے پانچ لاکھ بچ گئے۔ بس اب تو اسے یہی کام ہاتھ آ گیا۔ دوسرے تیسرے سال ہی اپنا فلیٹ بیچ کر کسی دوسری نئی جگہ پر ستا فلیٹ خرید لیتا۔ بمبئی میں بہت سے دوسرے لوگ بھی یہی دھندا کرتے تھے۔ اس شہر میں فاصلے تو کوئی معنی نہیں رکھتے تھے کیونکہ بجلی کی ہر وقت چلنے والی تیز رفتار لوکل ٹرینوں سے سب اسٹیشن ایک دوسرے سے جڑے ہوئے تھے۔

سیف خاں اور خانم نے شادی کے بعد کی ساری زندگی بمبئی کے گنجان آباد علاقوں میں گزاری تھی۔ مکانوں کی اس ادلا بدلی اور بھاگ دوڑ میں پیسہ تو بن گیا مگر وہ رشتے داروں اور دوسرے جان پہچان کے لوگوں سے اپنے آپ کو کٹا کٹا سا محسوس کرنے لگے۔ پھر سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ شادی ایک لڑکی کی بھی نہیں ہوئی اور نغمہ تو اٹھائیس سال کی ہو گئی اور جہاں تک عمر کا تعلق تھا تینوں ہی لڑکیاں شادی کے قابل تھیں۔ سیف خاں کو پتہ لگا کہ بھنڈی بازار میں ایک پرانی بلڈنگ میں جس کا نام 'حسینی بلڈنگ' تھا' تیسرے مالے پر ایک دو بیڈروم کا فلیٹ صرف سات لاکھ میں مل رہا تھا۔ خانم سے صلاح کر کے اس نے اُس فلیٹ کا سودا کر لیا اور اپنے فلیٹ کو بیچ کر اس فلیٹ میں بھنڈی بازار چلا گیا۔ اس میں بھی دو لاکھ کا فائدہ ہو گیا مگر اب نغمہ کی شادی کے فکر نے گھیر لیا۔ سیف خاں قدرے پچھتا بھی رہا تھا کہ اس نے نو سال پہلے جب نغمہ صرف انیس سال کی تھی، اس کے لیے ایکٹر اسلم کا رشتہ ٹھکرا دیا تھا۔ اسلم تو اب ایک بڑا اداکار بن گیا تھا اور جوہو میں ایک عالیشان مکان

میں اپنی رقاصہ بیوی نور کے ساتھ رہتا تھا۔

بھنڈی بازار کا علاقہ بڑا ہی گنجان آباد تھا اور ہر قماش کے لوگ یہاں رہتے تھے۔ حسینی بلڈنگ بہت پرانی اور بوسیدہ تھی جسے پچھتر سال قبل کسی حاجی رحمت اللہ نے اپنی نجی جائداد کے طور پر بنوا کر فلیٹوں کے حساب سے بیچ دیا تھا۔ اس لیے اس کی کوئی سوسائٹی نہیں تھی اور مشترکہ سہولتوں کا حال بُرا تھا۔ لفٹ ہر دوسرے تیسرے دن خراب رہتی اور زینوں میں اندھیرا رہتا۔ جس کو تکلیف زیادہ ہوتی اپنے خرچے پر بلب لگا لیتا یا لفٹ ٹھیک کرواتا۔ فلیٹ مالکوں یا کرائے داروں کی انتظامی کمیٹیاں اگر بنتیں بھی تو ایک آدھ مہینے میں ختم ہو جاتیں۔ یہ چھ فلور کی بلڈنگ تھی اور سر بازار تھی۔ ہر فلور پر چار فلیٹ، دو دائیں طرف اور دو بائیں طرف، تھے اور چونکہ نیچے مکینوں کا کوئی بورڈ نہیں تھا سوائے ڈاکیئے کے کسی کو معلوم نہیں تھا کہ کون کس منزل پر اور کس نمبر کے فلیٹ میں رہتا ہے۔ نہ اس میں رہنے والے ایک دوسرے کو جانتے تھے۔ ہاں ہر فلیٹ کا نمبر نمایاں طور پر اُس کے دروازے کے اوپر پتھر پر کھدا ہوا تھا لیکن کسی نے اپنے نام کی تختی نہیں لگا رکھی تھی۔ ہاں پانچویں اور چھٹے مالے پر تین فلیٹ ایسے تھے جن پر کچھ نشان دہی درج تھی۔ چھٹے مالے پر فلیٹ نمبر ۲۳ پر ''خوش آمدید'' کی تختی رہنے والے کی خوش مزاجی اور شائستگی کا پتہ دیتی تھی۔ پانچویں مالے پر فلیٹ نمبر ۱۹ پر ''میوزک کالج' کا چھوٹا سا بورڈ لگا ہوا تھا اور برابر میں ہی ۲۰ نمبر پر دروازے پر ہی ایک چھوٹے سے چپکائے ہوئے گتے پر 'آزاد کلب' لکھا ہوا تھا۔ بلڈنگ میں سکیورٹی نام کو بھی نہیں تھی حتیٰ کہ صدر دروازہ بھی ساری رات کھلا رہتا تھا اور کون اوپر چڑھتا ہے اور نیچے اترتا ہے کسی کو نہ معلوم ہوتا تھا اور نہ کوئی پوچھتا تھا۔ ہاں اندر سے سب فلیٹ محفوظ تھے اور کھڑکیاں باہر کی جانب کھلتی تھیں، یعنی بازار کی طرف اور دوسری طرف کے آدھے فلیٹوں کی پچھلی جانب اور اُدھر بھی ایک چھوٹا بازار تھا۔

سیف خاں نے اپنے فلیٹ میں آنے سے پہلے فلیٹ میں سارا کام معہ رنگ روغن کے کرالیا تھا اور بہت سی چیزیں بدلوالی تھیں، اس لیے خانم اور لڑکیاں تو ایک ہر لحاظ سے چمچماتے ہوئے فلیٹ میں ہی داخل ہوئی تھیں۔ گھر کا سارا سامان جدید طرز کا عمدہ تھا ہی۔ اس لیے فلیٹ میں جہاں تک رہائش کا تعلق تھا، سب نے پورا آرام محسوس کیا۔ ہاں خانم کو اور لڑکیوں کو یہ بات بڑی اکھری کہ کسی بھی کھڑکی میں کھڑے ہو جاؤ بمبئی کا سمندر

نہیں نظر آتا تھا اور وہی بازار کا بے ہنگم شور اور اونچی اونچی عمارتوں کا جنگل منہ پھاڑ کر سامنے کھڑا ہو جاتا تھا!

جس روز یہ لوگ اپنے فلیٹ میں آئے تھے، برتن مانجھنے اور جھاڑو پوچا کرنے والی بائیوں نے حملہ سا بول دیا تھا۔ خانم نے ایک بوڑھی سی نحیف بائی کو رکھ لیا تھا اور وہ دونوں وقت کا کام صفائی سے کر جاتی تھی۔ نوکروں کے معاملے میں خانم بڑی محتاط بلکہ دانشمند تھی۔ وہ پورے وقت کے ملازم یا ملازمہ رکھنے کے سخت خلاف تھی چاہے گھر میں اس کے رہنے کے لیے الگ جگہ بھی ہو۔ اگر وہ بھی صوبہ سرحد کی پٹھانی تھی تو شاید اُس نے کسی بوڑھی سے پشتو کا یہ مقولہ سن لیا تھا کہ گھر میں جوان یا بوڑھے میاں کے ہوتے ہوئے جوان خادمہ کا رکھنا گھر کے سکون کو آگ لگانا تھا۔ ایک مرتبہ سیف خاں سٹوڈیو سے ایک بارہ سال کا لڑکا لے بھی آئے تھے کہ اسے ملازم رکھ لو مگر خانم نے صاف انکار کر کے اُسے لوٹا دیا تھا اور بعد میں سیف خاں کو بتا دیا تھا کہ لڑکیوں کے گھر میں وہ اس سے چھوٹا لڑکا بھی نہیں رکھے گی۔

ایک روز لفٹ خراب تھی تو نغمہ نے سیڑھیوں سے نیچے اترنا شروع کر دیا۔ نیچے ہی بازار سے دو ایک چیزیں لانی تھیں۔ جب نغمہ بلڈنگ سے باہر نکلنے والی تھی تو اس کا سامنا اندر آتی ہوئی ایک نہایت خوبصورت نوجوان لڑکی سے ہو گیا۔ وہ لڑکی نغمہ کے ہاتھ میں تھیلا دیکھ کر سمجھ گئی کہ یہ لڑکی حسینی بلڈنگ کی ہے۔ وہ مسکرا کر نغمہ سے بولی۔

''میرا نام شیلا ہے اور میں ۲۰ نمبر میں رہتی ہوں۔ کیا تم لوگ حال ہی میں اس بلڈنگ میں آئے ہو؟''

''جی ہاں۔ میرا نام نغمہ ہے۔ ہم نے ۱۲ نمبر کا فلیٹ خریدا ہے، تیسرے مالے پر۔''

''کچھ کرتی ہو؟'' شیلا نے پوچھا

''جی نہیں۔ دو چھوٹی بہنیں ہیں، ان کے ساتھ گپ مار لیتی ہوں، کتابیں اور رسالے پڑھ لیتی ہوں۔ گھر کے کام میں امی کا ہاتھ بٹا دیتی ہوں۔''

''اور تمہارے ابا؟''

''وہ اپنا کام کرتے ہیں۔ صبح جا کر شام کو لوٹ آتے ہیں۔''

''ایسا لگتا ہے تمہاری شادی نہیں ہوئی'' شیلا بولی ''تیس چوبیس کی تو ہو گی؟''

''عمر تو خیر اٹھائیس کی ہوگئی ہے۔'' نغمہ معصومیت سے بولی ''مگر شادی ابھی نہیں ہوئی۔ اچھا تو اجازت دیجیے۔ بازار سے ایک دو چیزیں لانی ہیں۔''

''ہاں ہاں اپنا کام کرلو۔ کبھی آنا میرے یہاں۔ میں نے ایک کلب چلا رکھا ہے اور کئی لڑکیاں اور عورتیں آتی ہیں۔ تمہارا جی لگ جائے گا۔ میں لفٹ ٹھیک کرنے والے کو بلانے گئی تھی۔ اپنے خرچے سے لفٹ ٹھیک کراتی رہتی ہوں۔ بڑا برا حال ہے اِس بلڈنگ کا۔''

کوئی ایک ہفتے کے بعد، صبح دس بجے شگفتہ اور شبنم نے نیچے اترنے کے لیے لفٹ روکی تو اس میں ایک سانولے رنگ کی قبول صورت نوجوان برقعہ پوش لڑکی پہلے ہی سے موجود تھی۔ یہ الماس تھی جس کے پانچویں فلور کے فلیٹ پر 'میوزک کالج' کا بورڈ لگا ہوا تھا۔ وہ اپنے نین نقش سے اتر پردیش کی رہنے والی لگتی تھی مگر شگفتہ اور شبنم کو اس کے بھاری میک اپ کو دیکھ کر وحشت سی ہوئی۔ لفٹ میں تو انہوں نے محض ایک دوسرے کو دیکھا تھا اور نیچے تک اترنے میں تو صرف آدھا منٹ لگا تھا۔ شگفتہ اور شبنم ذرا جلدی میں تھیں کیونکہ وہ اپنی امی کے کہنے پر اپنی ایک رشتے کی بوا، رحیمن کے یہاں جا رہی تھیں اور انہیں دادر کی بس پکڑنی تھی۔ مگر وہ لفٹ سے باہر نکلی ہی تھیں کہ الماس نے انہیں روک لیا اور مسکرا کر بولی۔

''ہم لفٹ میں گونگی بن کر کھڑی رہیں۔ سچ بے گانگی اور ناواقفیت بھی کتنی بُری شے ہے۔ کیا تم دونوں یہاں کسی سے ملنے آئی تھیں یا یہیں رہتی ہو؟ میں الماس ہوں اور پانچویں مالے پر میرا میوزک کالج ہے۔''

''میرا نام شگفتہ ہے'' شگفتہ بولی ''اور یہ میری چھوٹی بہن شبنم ہے۔ ہم ایک ڈیڑھ مہینے پہلے ہی اس بلڈنگ میں ۱۲ نمبر میں آئے ہیں۔ ہماری ایک بڑی بہن ہے، نغمہ۔''

''بڑی حسین ہو تم دونوں۔ اللہ نظر بد سے بچائے'' الماس نوجوان ہوتے ہوئے بھی بڑی عورتوں کی طرح بولی، ''میرے ہاں آنا کبھی دونوں۔ حسینی بلڈنگ کی زندگی تو بڑی پھیکی اور بے مزہ ہے۔ موسیقی کا شوق ہو تو سیکھ لو دو چار پھڑکتی ہوئی غزلیں۔ قسم خدا کی حسینہ غزل گو بھی ہو تو چار چاند لگ جاتے ہیں اس کے حسن میں۔''

شگفتہ اور شبنم الماس کی طرزِ گفتگو سے متاثر ہوگئیں۔ شگفتہ کو تو اردو غزلوں کا بڑا شوق تھا۔ وہ معصومیت سے بولی۔

''آپ گانا سکھانے کی کیا فیس لیتی ہیں؟''

الماس ہنس پڑی اور بولی۔

''پہلے آؤ تو۔ فیس کا معاملہ تو یسا اہم نہیں ہے۔ میرا کالج تو محبت کی بنیاد پر چلتا ہے۔ ایک دو مہینے میں ایسا گلا تیار کردوں گی کہ آواز میں شعلہ سا نکلے گا۔''

شگفتہ اور شبنم الماس کا منہ تکتی رہ گئیں مگر مزید کچھ کہے بغیر ''خدا حافظ'' کہہ کر باہر نکل آئیں۔

اس شام کو سیف خاں ذرا جلدی آ گیا اور آتے ہی خانم کے کمرے میں جا کر اور ایک کرسی پر بیٹھ کر بولا۔

''بھیجا تھا لڑکیوں کو رحیمن کے یہاں؟''

''نغمہ تو گئی نہیں۔ شگفتہ اور شبنم گئی تھیں اور چار پانچ بجے لوٹ آئی تھیں''

''تم بھی کیا غضب کرتی ہو'' سیف خاں بولا ''نغمہ کا ہی جانا تو سب سے ضروری تھا۔ ایک طرف تو تم میری جان کھائے رہتی ہو کہ نغمہ کی شادی کا کچھ کرو اور میں کچھ کرتا ہوں تو تم سب الٹا سیدھا کر دیتی ہو۔''

اجی تو کیا آپ نے مجھے کچھ بتایا تھا؟'' خانم بولی'' آپ تو صرف یہ کہہ کر چلے گئے تھے کہ پشاور والی آپ کی چچیری بہن رحیمن لڑکیوں کو یاد کر رہی تھی، بھیج دینا انہیں۔ جس نے جانا چاہا چل گئی۔ مجھ پر الزام دھرنے سے پہلے سوچ لیا کریں۔ اب بتائیے کیا بات ہے۔''

''رحیمن کے دونوں لڑکے سجاد اور لطیف شارجہ سے واپس آ گئے ہیں۔ اب وہ لوٹ کر نہیں جائیں گے اور بمبئی میں ہی بزنس کریں گے۔ میں وہاں کل گیا تھا اور رحیمن اور محمد خاں دونوں مل گئے تھے۔ لڑکوں کو دیکھ کر طبیعت خوش ہو گئی۔ نہایت حسین شخصیت کے مالک ہیں۔ سجاد اپنی نغمہ سے ایک سال بڑا بھی ہے۔ وہ فوراً دونوں لڑکوں کی ایک ساتھ شادی کرنا چاہتے ہیں۔ لڑکے خوبصورت لڑکی چاہتے ہیں۔ میں نے تو کچھ نہیں کہا مگر رحیمن اور محمد خاں بولے کہ اگر منظور ہو تو نغمہ کو کل بھیج دو۔ بہت دنوں سے آئی بھی نہیں ہے۔ سجاد نے بچپن میں تو دیکھی تھی مگر اب کی اور بات ہے۔ دونوں کو یقین تھا کہ سجاد نغمہ کو ضرور پسند کرے گا۔ اور تم نے کچھ کا کچھ کر دیا۔''

''سنیئے ابھی کچھ نہیں بگڑا'' خانم بولی ''صبح دس بجے آپ مجھے اور نغمہ کو کار میں ان کے یہاں چھوڑ آئیے اور آپ کو جہاں جانا ہو وہاں سے چلے جائیے۔ میں سارا معاملہ سنبھال لوں گی۔ دیکھیے کچھ عذر نہ کیجیے ورنہ ہماری نغمہ ساری عمر کنواری بیٹھی رہے گی۔''

''خدا پر بھروسہ رکھو۔ کوئی بھی کام اس کی رضا کے بغیر نہیں ہوتا۔'' سیف خاں ہاں کرتا ہوا بولا۔

اگلے روز کوئی ساڑھے دس بجے سیف خاں خانم اور نغمہ کو لے کر رحیمن کے یہاں پہنچ گیا۔ گھنٹی بجانے پر دروازہ سجاد نے ہی کھولا اور وہ نغمہ کو دیکھ کر ٹھٹھک کر رہ گیا۔ اتنی حسین لڑکی تو اس نے آج تک نہیں دیکھی تھی۔ رحیمن کی لڑکی فوزیہ نغمہ کو لے کر اپنے کمرے میں چلی گئی اور سجاد بھی وہیں پہنچ گیا۔ سیف خاں نے رحیمن اور محمد خاں کو ساری بات بتائی تو دونوں ہنس پڑے۔ رحیمن بولی۔

''بھائی میں تو یہ سمجھی کہ شاید نغمہ شادی نہیں کرنا چاہتی۔ اب ہوا یہ کہ شام کو لڑکیوں کے جانے کے بعد میں نے سجاد اور لطیف سے معلوم کیا تو دونوں کو دونوں ہی لڑکیاں پسند آ گئیں یعنی سجاد کو شگفتہ اور لطیف کو شبنم۔ خیر لڑکیوں کو تو کچھ پتہ ہی نہیں تھا۔ اچھا کیا آپ لوگ نغمہ کو لے آئے۔ آپ بیٹھے رہیے، تھوڑی دیر میں میں سجاد سے بات کر لوں گی اور لطیف نے تو کل شگفتہ کو دیکھ ہی لیا تھا۔''

''بھائی جان'' محمد خان مسکرا کر بولا ''اگر سجاد کو نغمہ اچھی لگی تو پھر لطیف کے لیے آپ کو شگفتہ کے لیے ہاں کرنی پڑے گی اور ایک ہی دن دونوں شادیاں ہوں گی، یہ سوچ لیجیے۔''

''اور منگنی دونوں کی ایک ہفتے کے اندر اور نکاح خوانی تاریخ نکلوا کر ایک یا زیادہ سے زیادہ دو مہینے میں۔''

رحیمن اور خانم تو یہ بات سن کر پھولی نہ سمائی۔ جب ایک ڈیڑھ گھنٹے کے بعد رحیمن نے سجاد سے بات کی تو وہ فوراً نغمہ کے لیے مان گیا۔ نغمہ کو دیکھ کر اور اُس سے بات کر کے تو سجاد کو ایسا محسوس ہوا تھا جیسے خدا نے نغمہ کو بنایا ہی اس کے لیے تھا۔ لطیف تو مسخرہ تھا اور گھر میں سب کو ہنساتا رہتا تھا۔ جب اکیلے میں رحیمن نے اس سے پوچھا تو وہ اپنی امی کے گلے میں بانہیں ڈال کر بولا۔ ''امی اگر آپ کسی کالی کلوٹی بدشکل لڑکی سے بھی میری شادی کر دیں گی

تو میں کرلوں گا بشرطیکہ وہ آپ کا انتخاب ہو۔ ویسے آپ کے اس بیٹے کو شگفتہ ہی پسند تھی مگر ہمیں کیا معلوم تھا وہ شبنم سے عمر میں بڑی تھی اور بھائی جان کو الاٹ کردی جائے گی۔''

خانم نے گھر لوٹ کر سب سے پہلے دوزانو ہو کر اس خدائے برتر کا شکر ادا کیا جس کے حکم کے بغیر اس زمین پر پتہ بھی نہیں چلتا۔ یا تو ایک لڑکی کی شادی کے بھی آثار نہیں تھے یا دونوں بڑی لڑکیوں کا رشتہ یوں آناً فاناً طے ہو گیا!

منگنی تو دونوں لڑکیوں کی اسی بلڈنگ سے بڑی عمدگی اور سلیقے سے ہوگئی یہاں تک کہ مہندی لگانے والی بھی تاج ہوٹل سے آئی۔ مگر خانم اس کے دو دن بعد ہی سیف خاں سے بولی۔

''کیا آپ میری ایک بات جانیں گے؟''

''تم حکم تو کرو۔ میں نے کیا تمہاری کوئی بات کبھی ٹالی ہے؟'' سیف خاں اچھے موڈ میں تھا۔

''میں کئی دن سے یہ بات کہنا چاہ رہی تھی مگر ہمت نہیں ہوئی۔ مجھے اِس بلڈنگ میں آنا شروع دن سے ہی اچھا نہیں لگا تھا۔ جانے کس کس قسم کے لوگ یہاں رہتے ہیں۔ پھر ایسے بھیڑ بھڑ کے والے بازار میں اس بوسیدہ عمارت کی رہائش مجھے تو ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ پھر یہاں سے دو دو لڑکیوں کی اور وہ بھی ایک ساتھ شادی کیسے کروگے؟ کس گندے سے مسافر خانے میں بارات ٹھہراؤ گے اور کہاں لگاؤ گے ٹینٹ اور خیمے؟ یہ بازار تو ساری رات بند نہیں ہوتا۔ پھر ان کی اور ہماری دونوں کی ساکھ کا سوال ہے۔''

''بات تو تم ٹھیک کہہ رہی ہو'' سیف خاں سوچتے ہوئے بولا ''مگر اب ہو کیا سکتا ہے۔''

''دیکھیے شادی میں ابھی پورے دو مہینے ہیں۔ اپنے پراپرٹی ڈیلر سراج کو پکڑیئے۔ وہ یہ فلیٹ بکوا دے گا اور کسی اچھی بستی میں دوسرا دلوا بھی دے گا۔ کچھ گھاٹا ہی ہو جائے گا۔ آج ہی بات کریئے گا۔''

''کرتا ہوں کچھ۔'' سیف خاں بولا اور تیار ہو کر باہر نکل گیا۔

سراج کے پاس کئی تیار سودے تھے۔ کیونکہ وہ اس فلیٹ کی کمیشن چند ماہ پہلے ہی لے چکا تھا اور اس کا اور سیف خاں کا پرانا تعلق تھا اس نے صرف نئے فلیٹ کی کمیشن لینا

منظور کرلیا۔ اس نے چند دنوں میں ہی ورلی کی طرف ایک عمدہ آبادی اور نئی بنی بلڈنگ میں ایک فلیٹ دلوادیا جس کی کھڑکیاں سمندر کی طرف کھلتی تھیں۔ اگرچہ اس کی قیمت تو کافی زیادہ تھی مگر فلیٹ خانم اور لڑکیوں کو بہت پسند آیا تھا۔

جب سیف خاں کے سامان کے لیے ایک بڑا ٹرک حسینی بلڈنگ کے سامنے کھڑا ہوگیا اور چھ مضبوط مزدوروں نے بھاری اور ہلکا سامان نیچے اتار کر ٹرک پر لادنا شروع کردیا تو اوپر سے کئی کھڑکیاں کھلنے لگیں اور ان میں کھڑی عورتیں نیچے جھانکنے لگیں۔ انہیں جلد ہی پتہ لگ گیا کہ تین نوجوان اور حسین لڑکیوں والا کنبہ جو صرف چند مہینے ہوئے ۱۲ نمبر میں آیا تھا، یہاں سے جا رہا تھا۔ اوپر سے جھانکنے والی عورتوں میں شیلا اور الماس بھی تھیں۔ سب سے اوپر ۲۳ نمبر سے جس پر 'خوش آمدید' لکھا ہوا تھا، ایک عورت، گلنار، بھی جھانک رہی تھی۔ گلنار بھی جوان اور حسین تھی مگر اس کے چہرے پر اداسی اور ناکامی کی جھلک تھی۔ جب تک ٹرک سامان لے کر چلا نہیں گیا، عورتیں یونہی کھڑی جھانکتی رہیں۔ مگر جب سیف خاں نے اپنی گاڑی نیچے لگالی اور خانم اور لڑکیاں نیچے اتر آئیں تو انہیں دیکھتے ہی، جذبۂ تجسس میں یا پڑوسن ہونے کے ناتے، شیلا، الماس اور گلنار بھی فوراً نیچے اتر آئیں اور کار سے ذرا دور کھڑی ہوگئیں۔ تینوں لڑکیوں نے مسکرا کر انہیں 'آداب' کہا۔ جب لڑکیاں اور خانم بھی کار میں بیٹھ گئیں تو شیلا بولی۔

''میں نے تو لڑکیوں کی ماں کو آج دیکھا ہے۔ اس عمر میں اور یہ حسن۔ لڑکیاں ماں پر گئی ہیں۔''

''ہائے کیا دلنواز فاختائیں تھیں!'' الماس آہ بھر کر بولی ''شاخ پر بیٹھی بھی نہیں تھیں کہ اُڑ گئیں اور صیاد دام بچھائے بیٹھا رہا!''

''فاختائیں وہ نہیں، ہم نصیبوں جلی ہیں'' گلنار بولی ''جو ایک شاخ سے اُڑ کر دوسری پر بیٹھ جاتی ہیں اور جنہیں عمر بھر قرار نہیں ملتا۔ وہ تو نیک بیبیاں تھیں۔ دیکھا نہیں دو لڑکیوں کے ہاتھ میں تو مہندی رچی تھی۔ اچھا ہوا نکل گئیں یہاں سے۔''

چکنے فرش

رضا پور اب وہ پرانا پرسکون شہر نہیں تھا۔ پچھلے پندرہ بیس سالوں میں شہر چاروں اطراف میں بری طرح پھیل گیا تھا اور آبادی کئی گنا بڑھ گئی تھی۔ جب سے یہ اسی نام کے نئے ضلع کا صدر مقام بنا تھا، یہاں کئی بڑے بڑے دفتر آگئے تھے اور کچھ نئے کھل گئے تھے۔ شہر کے بیرونی حصے میں ایک انڈسٹریل ایریا بھی قائم ہو گیا تھا جہاں کئی کارخانے اور ملیں کام کر رہی تھیں۔ بازار اب ایک نہیں چھ تھے اور محلّوں اور بستیوں تک میں رہائشی گھروں میں چھوٹی چھوٹی دکانیں کھل گئی تھیں۔ چوڑا بازار میں جو رضا پور کا سب سے قدیم اور بڑا بازار تھا اتنی بھیڑ ہونے لگی تھی کہ آدمی کا پیدل چلنا بھی دشوار تھا۔ مقامی لوگوں کے علاوہ پاس کے دیہات اور قصبوں سے بھی بڑی تعداد میں لوگ عدالتوں میں اور خرید و فروخت کے لیے ہر روز یہاں آتے تھے۔

رنجیت نگر رضا پور کی ایک جدید رہائشی کالونی تھی۔ اس میں زیادہ تر پنجابی رہتے تھے جن کا یہاں کے بیوپار اور انڈسٹری کو قائم کرنے اور اس کی توسیع میں ایک نمایاں کردار اور حصہ تھا۔ پنجابیوں کا معیار زندگی مقامی لوگوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ تھا۔ ان کے گھروں میں جو عمدہ اور قیمتی فرنیچر اور ساز و سامان ہوتا تھا وہ دوسروں کے یہاں نظر نہیں آتا تھا۔ رکھ رکھاؤ، فیشن، جسمانی خوبصورتی اور چستی پھرتی کے اعتبار سے بھی ان کے لڑکے اور لڑکیاں مقامی لوگوں کے لڑکوں اور لڑکیوں سے بڑے مختلف تھے۔ پنجابی لڑکیاں تو اپنے آپ کو دوسری لڑکیوں سے برتر سمجھتی بھی تھیں۔

شکھا رنجیت نگر کے راج کمار کھنہ کی اکلوتی لڑکی تھی۔ مگر جہاں تک خوبصورتی، جسمانی دلکشی، فیشن، جدید تہذیب اور ہائی لائف کا تعلق تھا، وہ صرف رنجیت نگر کی ہی نہیں بلکہ سارے رضا پور کی نمایندگی کرتی تھی۔ کھنہ کی انڈسٹریل ایریے میں سب سے بڑی فیکٹری تھی اور اسی نے رنجیت نگر میں جدید طرز کی نہایت شاندار کوٹھی بنوائی تھی۔ شکھا کا ایک بڑا بھائی تھا نریندر۔ اس نے بی۔ اے کرنے کے بعد فیکٹری میں جانا شروع کر دیا تھا اور باپ کا ہاتھ بٹا رہا تھا۔ کھنہ ایک آزاد خیال آدمی تھا۔ اس کی بیوی شوبھا بھی اس سے کم نہیں تھی، صرف اس فرق کے ساتھ کہ وہ زیادہ سوشل تھی۔ وہ رضا پور کے تاج کلب کی ممبر تھی اور ہر روز شام کو کلب جا کر پہلے بیڈ منٹن اور پھر دیر تک دوسرے ممبروں کے ساتھ تاش کھیلنا اور ایک بھاری رقم ہارنا یا جیتنا اس کا معمول تھا۔ کھنہ اپنے بزنس کے کاموں میں پھنسا رہتا اور اگرچہ وہ خود بھی کلب کا لائف ممبر تھا مگر کلب میں وقت گزارنا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ مگر وہ ایک عمدہ شوہر تھا اور رات کو کلب سے شوبھا کو اپنی کار میں لانا بھی نہیں بھولتا تھا۔ گھر میں تین عمدہ اور قیمتی کاریں تھیں اور اگرچہ دو ڈرائیور تھے مگر گھر مین سب شکھا اور شوبھا سمیت کار بخوبی چلاتے تھے۔

شکھا بائیس سال کی تھی۔ قد پانچ فٹ سات انچ تھا اور جسم اکہرا، سڈول اور متناسب۔ رنگ سرخی مائل گورا اور چہرے کے خدوخال بے حد جاذبِ نظر۔ چال میں ایک تمکنت مگر دیدہ زیب اچھال۔ عموماً سنجیدہ رہتی مگر مسکراتی یا ہنستی تو بھرپور ہونٹ کسی خوشنما پھول کی پنکھڑیاں بن جاتے۔ جھیل کی طرح وسیع اور گہری آنکھیں، جن میں ستارے سے چمکتے رہتے۔ پہلے اپنے گھنے اور لمبے بالوں کو کسی بندش میں مبتلا کیے بنا لاپرواہی سے اپنی کمر پر ایک آبشار کی شکل میں ڈال لیتی تھی مگر چند مہینوں سے انہیں چھوٹا کروالیا تھا اور وہ اب شانوں پر بسیرا ڈالے رہتے۔ اس سے اس کی شخصیت اور نکھر آئی تھی۔ اس نے پچھلے سال رضا پور کے گورنمنٹ کالج سے بی۔ اے کیا تھا۔ وہ پڑھائی میں زیادہ ہوشیار نہیں تھی مگر انگریزی روانی سے بولتی تھی۔ کھنہ کا ارادہ شکھا کو ڈاکٹر بنوانے کا تھا مگر چونکہ شکھا کے نمبر کبھی بھی پینتالیس یا پچاس فیصدی سے زیادہ نہیں آئے تھے وہ ایک بھاری رقم چندے کے طور پر دے کر اسے احمد آباد یا بنگلور کے کسی میڈیکل کالج میں بھی داخلہ دلانے کو تیار تھا۔ لیکن اس منصوبے میں بھی کامیابی نہیں ملی کیونکہ شکھا کے پاس

کبھی بھی سائنس کے مضامین نہیں تھے۔ تاہم اس سے گھر میں کسی کو مایوسی نہیں ہوئی کیونکہ شکھا کو آگے پڑھنے یا کام کرنے کی تو ضرورت تھی ہی نہیں۔ وہ ایک دولت مند گھرانے کی بے حد حسین لڑکی تھی اور جلد یا بدیر اس کی کسی امیر خاندان کے بزنس میں لڑکے سے شادی ہونا ناگزیر تھا۔ فی الحال شکھا نے ہی اپنی ممی اور پاپا سے کہہ دیا تھا کہ وہ ابھی دو سال اور شادی کے بندھن میں پھنسنا نہیں چاہتی تھی۔

شکھا کی کئی کالج کی سہیلیاں ابھی رضا پور میں ہی تھیں۔ ایک تھی سونم جو اُس کی ہی کالونی میں تیسری سڑک پر آخری کوٹھی میں رہتی تھی۔ وہ اس کی ہی عمر کی ایک مقامی بزنس مین کی لڑکی تھی۔ وہ بی۔ اے کی طالبہ تھی۔ چھوٹے قد کی، قدرے موٹی اور سیدھی سادی لڑکی تھی جسے اپنی پڑھائی اور گھر کے کام کاج میں دلچسپی تھی۔ دولتمند ہونے کے باوجود اس کے گھر والے قدامت پسند تھے۔ سونم شکھا کو بہت پسند کرتی تھی مگر شکھا اس کے زیادہ قریب کبھی نہیں آئی۔ لیکن بولنا چالنا، ملنا جلنا دو سہیلیوں کی طرح ہی تھا۔ شکھا تو صرف دو ایک بار ہی سونم کے گھر گئی تھی مگر سونم شکھا کے گھر آتی رہتی تھی۔

دوسری سہیلی شہلا تھی جو انگریزی کے پروفیسر امجد حسین کی بیٹی تھی۔ وہ شہر میں محلہ خاقانی میں رہتی تھی جہاں ان کا پرانا، پشتینی مکان تھا۔ شہلا بی۔ اے کے سکینڈ ایر تک تو کالج میں شکھا کے ساتھ ہی پڑھی تھی مگر پھر اس نے اچانک کالج چھوڑ دیا اور گھر پر بیٹھ کر بی۔ اے خط وکتابت کے کورس سے کرنے لگی۔ دراصل اس کی والدہ بیمار رہتی تھی اور گھر میں بھی بمشکل چل پھر سکتی تھی۔ ایسے میں دو اسکول جانے والے چھوٹے بھائیوں اور ایک چھوٹی بہن کی ذمے داریاں اور گھر کا کام کاج نبھ نہیں پا رہا تھا۔ شہلا نے خود ہی گھر کے مفاد میں ابا اور امی کے منع کرنے پر بھی کالج چھوڑنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ گھر بھی ٹھیک طور پر چلنے لگا تھا اور وہ اپنی پڑھائی پر پوری توجہ دے پا رہی تھی۔ اس طرح اس نے سیکنڈ ڈویژن میں بی۔ اے پاس کرلیا تھا۔

شہلا نہایت حسین لڑکی تھی۔ اس کا رنگ صبحِ صادق کی طرح سلونا اور پیارا تھا۔ کوئی بھی اُسے دیکھتا تو اس کا جی بار بار اُسے دیکھنے کو کرتا۔ اس کی گفتگو میں ایک شیرینی، ایک حلاوت گھلی تھی جس کے اثر کو وہ اپنی کھنکھتی ہنسی اور دلفریب مسکراہٹ سے اور بڑھا دیتی۔ اُس نے بھی اپنے اکیسویں سال میں قدم رکھا تھا۔ شکھا شہلا کو بہت پسند کرتی

تھی مگر اس کے برقعے سے بہت تنگ تھی۔ بھلا کسی نے کرنوں اور چاند کی روشنی پر بھی پہرہ بٹھایا ہے۔ مگر شہلا کالج میں بھی برقعے میں آتی تھی اور شکھا کے گھر بھی۔ دراصل وہ کبھی بھی گھر کے باہر برقے کے بغیر نہیں نکلی اگرچہ وہ نقاب ضرورت کے مطابق اٹھالیتی تھی۔ مگر شکھا شہلا کو برقعے میں دیکھ کر جھنجھلا جاتی تھی اگرچہ اس کا اظہار اس نے شہلا سے کبھی نہیں کیا۔ مگر وہ سوچتی کہ کیا کوئی دمکتا تازہ یوں اپنی آنکھ بدلی میں چھپائے رکھتا ہے؟ یہ ڈھیر سارا حسن اور یوں مستور!

ایک سہیلی سیما تھی جو جوگن پاڑہ میں رہتی تھی۔ اس نے شکھا کے ساتھ ہی بی۔ اے کیا تھا اور تقریباً اس کی ہی عمر کی تھی۔ پتلی دبلی اور اوسط قد کی مخصوص اتر پردیش کی لڑکی گورا رنگ اور تیکھے نقوش۔ بات کرتے ہوئے جھجک اور شرم۔ چہرے کا تمام میک اپ آنکھوں میں کاجل کے ڈورے اور ہلکے پاؤوڈر پر مشتمل۔ بارڈر والی ہلکے رنگ کی سوتی ساڑھی پہنتی تھی۔ تیج تہواروں پر اور شادی بیاہ کے موقعوں پر گائے جانے والے گیتوں کا شوق تھا اور جب گاتی تو لہک لہک کر خود سپردگی کے عالم میں گاتی تھی۔

پورنیما کا شمار بھی شکھا کی سہیلیوں میں ہوتا تھا۔ وہ شہلا کے ہی محلے میں رہتی تھی اور وہ اور شہلا ملتی رہتی تھیں۔ نیا بازار میں پورنیما کے پتاجی کی کیمسٹ کی دکان تھی۔ وہ تیئس سال کی تھی اور کالج میں ایم۔ اے ہسٹری کی سٹوڈنٹ تھی۔ اس کے ماں باپ اس کے شادی کے لیے کئی جگہ بات چیت کر رہے تھے۔ رنگ ڈھلتی ہوئی شام کی طرح سنولایا ہوا اور چہرے کے نقوش پر کشش اور ان سے جھلکتی ہوئی بھرپور جوانی کی ہلکی سی سرخی۔ اکہرا جسم اور قد بھی مقابلتاً لمبا۔ اردو کی غزلیں گانے کا شوق تھا اور بہت عمدہ گاتی تھی۔ اس کی کاپی میں اردو کے معروف اور غیر معروف شعرا کی بہت غزلیں ہندی میں لکھی ہوئی محفوظ تھیں وہ تلفظ کی بھی کوئی غلطی نہیں کرتی تھیں کیونکہ اس معاملے میں وہ شہلا سے پوچھتی رہتی تھی جس نے بہت پہلے ادیب کامل کا امتحان پاس کر رکھا تھا اور جو اردو کے رسائل پڑھتی رہتی تھی۔

شکھا کو اچانک رضا پور میں ایک بیوٹی پارلر کھولنے کی سوجھ گئی۔ خالی بیٹھے اس کا وقت نہیں کٹتا تھا اور ٹی۔ وی کوئی کب تک دیکھے۔ وہ دن بھر گھر پر تنہا رہتی۔ اوب جاتی تو اپنی کسی سہیلی کو بلا لیتی یا خود اس کے گھر چلی جاتی مگر روز روز یہ بھی ممکن نہیں تھا۔ اس کی ممی یا تو اپنی کٹی پارٹیوں میں مصروف رہتی یا کلب میں وقت صرف کرتی۔ شکھا نے اپنے بیوٹی پارلر

کی تجویز اپنی ماں کے سامنے کہی تو اس نے فوراً ہاں کر دی اور کھنہ صاحب سے بھی بات کرنے اور ان کی رضامندی حاصل کرنے کا وعدہ کر لیا۔ مگر اس نے صاف لفظوں میں کہا۔

''مگر بیوٹی پارلر اس کوٹھی میں ہرگز نہیں کھلے گا۔ تمہیں مارکیٹ میں ایک بڑی جگہ کرایے پر لینی ہوگی اور ایک ہائی کلاس بیوٹی پارلر قائم کرنا ہوگا۔ دلی اور ممبئی جاؤ اور دیکھو کہ وہاں کے بیوٹی پارلر کیسے چلتے ہیں۔ وہیں سے جدید آلات اور مشینیں لاؤ۔ سارا بیوٹی پارلر ایر کنڈیشنڈ ہو اور اسے ایسا فرنش کرو کہ آنے والا عش عش کرے۔ فرشوں پر قیمتی قالین بچھاؤ۔''

''مگر ممی'' شکھا بولی ''ایسے بیوٹی پارلر کے لیے تو تین چار کمروں کا کمرشل فلیٹ لینا پڑے گا جس کا ماہانہ کرایہ رضا پور کی نئی مارکیٹ میں بھی آٹھ دس ہزار سے کم کیا ہوگا۔ اور جو چیزیں آپ بتا رہی ہیں ان پر تو بہت خرچہ آئے گا۔''

''کتنا خرچہ آ جائے گا؟'' اس کی ممی جھنجھلا کر بولی ''دو لاکھ، تین لاکھ یا پھر پانچ لاکھ؟ تم کیوں پرواہ کرتی ہو انوسٹمنٹ میں کروں گی۔''

''ممی مگر رضا پور میں ہائی لائف سوسائٹی ہے کہاں؟ کون سی عورتیں اور لڑکیاں ہمارے اس قسم کے بیوٹی پارلر میں آئیں گی؟ آمدنی تو چھوڑیے، خرچہ بھی نکلنا مشکل ہو جائے گا۔ اتنی انوسٹمنٹ کرنا بے کار ہے۔''

''تو تو کیا باربر شاپ اور مہندی لگانے کی دکان کھولے گی؟'' شکھا کی ممی تنک کر بولی ''اس کی اجازت نہ میں دوں گی نہ تیرے پاپا۔ اپنے سٹیٹس کا خیال تو تجھے رکھنا ہوگا۔ جب تک تیری شادی نہیں ہو جاتی، یہ تیرے اٹھنے بیٹھنے کا کلب ہی بن جائے گا۔ بعد میں اسے بیچ دیں گے۔ ہمیں آمدنی نہیں چاہیے۔''

بات بھی ٹھیک تھی اور شکھا رضامندی میں چپ ہو گئی۔ پہلے چار کمروں کا نئی مارکیٹ میں کمرشل فلیٹ لے لیا گیا اور پھر ایک مہینے کے اندر ہی نہایت شاندار اور جدید بیوٹی پارلر قائم ہو گیا۔ دلّی سے ہی ساری مشینیں، آلات اور سامان مل گیا اور وہیں سے دو ٹرینڈ نوجوان لڑکیاں بھی بیوٹیشنز کے طور پر زیادہ تنخواہ پر لائی گئیں۔ فی الحال ان کے رہنے کا انتظام بیوٹی پارلر کے پچھلے کمرے میں کر دیا گیا۔ یہ دونوں لڑکیاں نہایت سمارٹ اور خوش شکل تھیں اور ہر قسم کی جدید آرائش، میک اپ، بالوں کے تراشنے اور ان کی سیٹنگ کرنے میں ماہر تھیں۔ ایک کا نام کیتھی اور دوسری کا مارتھا، تھا۔

شکھا کے لیے یہ بیوٹی پارلر بہت اچھا ذاتی کلب ثابت ہوا۔ جس روز اس کا غیر رسمی افتتاح کیا گیا، اس روز راج کمار کھنّہ، مسز کھنّہ اور ان کے کچھ دوست اور سہیلیاں بھی آئی تھیں۔ شکھا نے اپنی سہیلیوں کو بھی بلایا تھا مگر صرف سیما ہی آسکی تھی۔ سب نے ہی اس بیوٹی پارلر کی بڑی تعریف کی۔ کھنّہ اور ان کی بیوی شوبھا کو شکھا کے ذاتی کمرے یا دفتر کی سجاوٹ بہت پسند آئی۔ اتنا ہائی گلاس فرنیچر تو امیر لوگوں کی کوٹھیوں میں بھی نہیں تھا۔ ہر کمرے میں ایر کنڈیشنر لگا تھا۔ سب مہمانوں نے بڑے آرام اور آسودگی کے ماحول میں چائے وغیرہ پی۔ کیتھی اور مارتھا کے فن کو آزمانے کے لیے اور دراصل اس موقعے اور ماحول کا پورا فائدہ اٹھانے کے لیے مسز کھنّہ اور ان کی دو سہیلیوں نے تو اپنے فیشیل کرانے کے بعد اپنے بال بھی سیٹ کروا لیے۔ جب انہوں نے چمچماتے آئینوں میں اپنی شکلیں دیکھیں تو ان کے ہونٹوں سے تعریفی احساس میں ایک سیٹی سی نکل گئی!

شکھا کا بیوٹی پارلر تھوڑا تھوڑا چلنے لگا۔ یہ پارلر ایک بے حد مصروف مارکیٹ میں بڑی نمایاں جگہ پر تھا۔ شکھا نے ایک چھوٹا مگر بے حد خوشنما اشتہار بھی چھپوا کر رضا پور کے تمام خوشحال علاقوں میں بٹوا دیا تھا۔ اس کی آمدنی خاطر خواہ تو نہیں بڑھی مگر چند مہینوں میں یہ خود کفیل ہو گیا لیکن شکھا کے لیے ایک پیسہ بھی نہیں بچتا تھا اور ڈھائی لاکھ کی انوسٹمنٹ پر کوئی ریٹرن نہیں تھی۔ بہر حال اس میں شکھا کا بڑا جی لگتا تھا اور یہاں اپنی سہیلیوں کے ساتھ گپ شپ مارنے اور کھانے پینے میں جو مزہ آتا تھا اتنا گھر پر کبھی نہیں آیا۔

شکھا کی جو سہیلیاں اس روز نہیں آئی تھیں بعد میں ایک ایک کر کے آ گئی تھیں۔ کوئی بھی سہیلی ادھر سے گزرتی تو شکھا سے ملنے چلی آتی اور ایک آدھ گھنٹہ بیٹھ کر چلی جاتی۔ کسی سہیلی کو گھر پر بیٹھے اکتاہٹ سی محسوس ہوتی تو کچھ خریدنے کے لیے بازار چلی آتی مگر شکھا سے اس کے بیوٹی پارلر میں ملے بغیر گھر نہ لوٹتی۔ سب سے کم شہلا یہاں آئی تھی، صرف دو تین بار کیونکہ اس کا گھر سے نکلنا کم ہی ہوتا تھا اور اُسے یہ اچھا بھی نہیں لگتا تھا۔ پھر کسی کے گھر جانا اور بازار میں بیوٹی پارلر میں جانے میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ سیما بھی کچھ اسی طرح کی تھی۔ کچھ لڑکیوں کے پاؤں میں شرم و حیا کی زنجیر بندھی ہوتی ہے۔

اس اثنا میں شکھا کا حلقۂ دوستی اور وسیع ہو گیا تھا۔ نئی سہیلیاں تھیں کنچن، نہایت چلبلی اور نخرے والی جو کسی اچھی تنخواہ والی ملازمت کی تلاش میں تھی اور کامنی، بے حد ہنسوڑ

اور باتونی۔ کنچن کے ذریعے شکھا کی دوستی دونو جوان بزنس مینوں چیتن ملہوترا اور بلجیت سے بھی ہو گئی تھی اور وہ ایک دو بار شکھا سے بیوٹی پارلر میں ملنے بھی آ چکے تھے۔ ان کی دلچسپی کیتھی اور مارتھا میں بھی تھی۔

رضا پور میں آج صبح تڑکے ہی موسلا دھار بارش ہوئی۔ گلیوں میں اور سڑکوں پر پانی بھر گیا اور باہر نکلنا اور چلنا مشکل ہو گیا۔ رکشا والے بھی ایسے موسم میں نہیں نکلے مگر اکا دکا رکشا والا درختوں کے نیچے اپنی بھیگی رکشا لیے کھڑا تھا۔ اوّل تو ایسے خراب موسم میں کوئی گھر سے نکلنے والا بھی نہیں تھا مگر چھاتہ لے کر مجبوری میں کوئی نکلتا بھی اور رکشا والے سے چلنے کے لیے پوچھتا تو وہ دگنا کرایہ مانگتا۔ کوئی بارہ بجے بارش رک گئی۔ تھوڑی ہی دیر میں مطلع صاف ہو گیا اور سورج ایک کونے میں سے نکل آیا۔ گلیوں اور سڑکوں پر سے پانی بہہ نکلا اور سڑکوں پر آمدورفت شروع ہو گئی۔ مگر موسم بھیگا ہی سا رہا اور یہ خدشہ بھی رہا کہ شاید بارش پھر آ جائے کیونکہ بادلوں کے کچھ ٹکڑے ابھی تک آسمان پر ادھر ادھر لٹکے ہوئے تھے۔ کوئی چار بجے اپنی پھولدار گلابی رنگ کی چھوٹی چھتری بغل میں دبائے سیما شہلا کے گھر پہنچی اور جاتے ہی اُس سے بولی۔

''شہلا شکھا کا فون آیا ہے۔ آج اس نے ہم سب کو چائے پر بلایا ہے اور تاکید کی ہے کہ میں تمہیں لیتی ہوئی آؤں وہ کہتی تھی کہ موسم خوشگوار ہے اور سب کو ملے ہوئے بھی کئی دن ہو گئے۔ اس نے خاص طور پر کئی طرح کے پکوڑوں اور آلو کی ٹکیوں کا وہیں آرڈر بھی دے دیا ہے۔''

''اس سے ملنے کو تو میرا بھی جی چاہتا ہے'' شہلا بولی ''مگر دقت یہ ہے کہ اس کے گھر نہیں بلکہ بیوٹی پارلر جانا ہو گا اور گھر لوٹتے لوٹتے سات ساڑھے سات بج جائیں گے۔ ایسے موسم میں امی اجازت دیں یا نہیں۔ پھر میرے گھر والوں کو تو یہ بھی نہیں پتہ کہ شکھا نے بیوٹی پارلر کھول رکھا ہے اور میں اس سے ملنے جب بھی گئی بیوٹی پارلر گئی، اس کے گھر نہیں امی کو تو یہی بتاتی ہوں کہ شکھا سے ملنے جا رہی ہوں اور وہ سمجھتی ہیں میں اس کے گھر جا رہی ہوں۔''

''آنٹی سے میں بات کر لیتی ہوں'' سیما بولی۔ اور اس نے یہ کہا ہی تھا کہ شہلا کی امی اندر سے اسی کمرے میں آ گئی۔ سیما نے کہا۔

’’آنٹی آپ کی اجازت ہو تو میں شہلا کو شکھا کے لے جاؤں۔اس نے ہم دونوں کو چائے پر بلایا ہے اور بڑا زور دیا ہے۔ گھنٹے دو گھنٹے میں آجائیں گے۔‘‘

’’بیٹی ایسے موسم میں؟ بارش پھر آگئی تو پھنس جاؤ گی۔اور اس کا گھر بھی تو دور ہے۔‘‘شہلا کی امی بولی۔

’’آنٹی ہمیں دیر نہیں لگے گی۔اور یہاں سے رکشا میں جائیں گے۔ میں اسے خود پہلے یہاں چھوڑ دوں گی۔آپ بے فکر رہیں اگر بارش ہوئی تو شکھا خود اپنی کار میں ہم دونوں کو چھوڑ دے گی۔‘‘

’’ٹھیک ہے تو ہو آؤ مگر اندھیرا ہونے سے پہلے آجانا۔اور شہلا تم بھی اپنی چھتری لے جانا۔‘‘ شہلا کی امی بولی اور چلی گئی شہلا جلد جلد تیار ہوئی، اپنی چھتری لی، برقعہ پہنا اور سیما کے ساتھ ہو لی۔باہر نکلتے ہی انہوں نے رکشا کر لی اور دس منٹ میں بیوٹی پارلر پہنچ گئیں۔باہر موسم بھیگا اور سہانا تھا مگر اندر شکھا کے کمرے میں اے۔سی چل رہا تھا اور خنکی تھی۔شکھا ان دونوں کو دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔شہلا نے اپنے برقعے کو کھونٹی پر ٹانگا اور بیٹھ گئی۔سیما بھی اس کے برابر میں بیٹھ گئی اور بات چیت شروع ہوگئی۔سونم اور پورنیما پہلے سے آئی ہوئی تھیں۔نئی سہلیاں کنچن اور کامنی بھی ایک صوفے پر بیٹھی تھیں۔شہلا اور سیما ان سے پہلے نہیں ملی تھیں مگر شکھا نے ان کے آتے ہی تعارف کرا دیا تھا۔

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بیوٹی پارلر میں اس وقت کوئی کام نہیں تھا کیونکہ کیتھی اور مارتھا بھی اندر اس کمرے میں شکھا کی ہدایات کے مطابق کچھ چیزیں ادھر اُدھر کر رہی تھیں۔ فارغ ہو کر شکھا اپنی سہیلیوں کے ساتھ بیٹھ گئی اور کیتھی اور مارتھا پارلر میں چلی گئیں۔ایک نہایت خوشگوار ماحول میں دل پذیر بات چیت اور قہقہوں کا اجلاس شروع ہو گیا اور شکھا کی فرمائش پر پورنیما نے ایک عمدہ غزل سنائی۔جب سیما کے سب سر ہو گئیں تو اس نے بھی ایک گیت سنا دیا۔اگر چہ سب لڑکیوں کو جیسے جیسے وہ آئیں کیتھی اور مارتھا نے کوک پلا دئے تھے مگر اب دروازے پر دستک ہوئی اور رستوران کے آدمی کئی ٹریز میں آرڈر کیا ہوا کھانے پینے کا سامان لے آئے اور وسیع سنٹر ٹیبل پر لگانے لگے۔شکھا نے یہ کہنے پر کہ کافی اور چائے آدھ گھنٹے بعد لانا، وہ چلے گئے اور کھانا پینا شروع ہو گیا۔بات چیت اور ہنسی مذاق جاری رہا۔آدھ گھنٹے کے وقفے کے بعد چائے اور کافی بھی آگئی۔ابھی چائے یا کافی کچھ لڑکیوں

نے اپنے پیالوں میں انڈیلی ہی تھی کہ ڈور کلوزر سے اپنے آپ بند ہونے والے دروازے پر پھر دستک ہوئی اور چیتن اور بلجیت داخل ہو گئے۔ یہ دونوں بلند قامت، حسین اور وجیہہ تھے اور سب لڑکیوں کی نگاہیں ان کی طرف اٹھ گئیں۔ شکھا اٹھی، انہیں ہیلو کہا اور ان سے ہاتھ ملایا۔ پھر اس نے دونوں کو اپنے برابر کی دو خالی کرسیوں پر بٹھالیا۔ شکھا نے دونوں کا تعارف باری باری اپنی ہر سہیلی سے کرانا شروع کیا۔ کنچن اور کامنی کو تو وہ جانتے ہی تھے۔ مسکراہٹوں، ہیلو اور ہائے کے درمیان دونوں نے اٹھ کر ہر لڑکی سے ہاتھ ملایا مگر جب شہلا کی باری آئی تو اس نے مسکرا کر ہیلو تو کہا مگر ملانے کے لیے ہاتھ نہیں بڑھایا اور چیتن اور بلجیت کے بڑھے ہوئے ہاتھ ہلکی سی انتظار اور مایوسی کے بعد واپس ہو گئے۔ اس بہت ہی دلکش سہیلی کا نام انہوں نے سن لیا تھا اور کھونٹی سے لٹکا ہوا ایک سیاہ برقعہ وہ دیکھ چکے تھے اور ایک کھلبلی ان کے دلوں میں مچ گئی تھی۔

اس بات کو نظر انداز کر دیں تو شکھا کی یہ محفل ہر لحاظ سے بڑی خوشگوار اور مزیدار تھی۔ گانوں کا دور پھر شروع ہو گیا اور اس کا آغاز بلجیت نے ایک نہایت جذباتی اور پرسوز فلمی گیت گا کر کیا۔ پورنیما نے ایک اور غزل سنائی۔ کنچن اور کامنی نے بھی گایا۔ جب آئے ہوئے ڈیڑھ دو گھنٹے گزر گئے تو شہلا کو لگا کہ یہ محفل تو شاید دیر تک چلے گی۔ اس نے اپنی کلائی پر بندھی گھڑی دیکھی اور پاس بیٹھی ہوئی سیما نے آہستہ سے کچھ کہا اور دونوں اٹھ گئیں۔ شکھا سے اجازت لی اور دونوں نے اپنی اپنی چھتری سنبھالی اور شہلا نے اپنا برقعہ پہنا اور ساتھ ساتھ باہر نکل گئیں۔ انہوں نے رکشا کی اور گھر کی طرف روانہ ہو گئیں۔ بتیاں تو جل گئی تھی مگر کوئی خاص دیر نہیں ہوئی تھی۔ رکشا میں دونوں نے کوئی خاص بات نہیں کی کیونکہ رکشا والے اپنا چہرہ اور نظریں تو سامنے سڑک پر رکھتے ہیں مگر اُن کے زیادہ کھلے ہوئے کان زنانہ سواریوں کی باتوں پر لگے ہوتے ہیں۔ مگر گلی کے باہر رکشا سے اتر کر اپنے گھر کی طرف بڑھتے ہوئے شہلا نے سیما سے کہا۔

"دیر تو ہو گئی ہے مگر تو مجھے گھر کے اندر تک چھوڑنے آ جائیو تو امی کچھ نہیں کہیں گی۔ لیکن میری بات سن، میں اب شکھا کے بیوٹی پارلر میں کبھی نہیں جاؤں گی۔ یہ مردوں کا وہاں آنا جانا، لڑکیوں سے ہاتھ ملانا، میں تو اس کے بارے میں سوچ کر ہی لرز جاتی ہوں۔ یہ ہمارے دین اور ہماری تہذیب کے سراسر خلاف ہے۔ تو سوچے گی کہ میں مذہب کی بات

لے بیٹھی لیکن چھوڑ اس پہلو کو مگر جس ماحول میں ہم گھریلو ہندوستانی لڑکیوں کی پرورش ہوتی ہے وہ اور ہماری قدریں اور شرم وحیا اس بات اور اس میل جول کی اجازت کہاں دیتی ہیں۔ میرے والدین مجھ پر جان چھڑکتے ہیں، میری شادی کی بات چیت کر رہے ہیں۔ میں تو اُن کے اعتماد کو ٹھیس پہنچانے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔''

''تو ٹھیک کہتی ہے'' سیما بولی ''پھر ہمارے پاس یہ دولت، یہ ذرائع ہیں کہاں۔ میں نے تو آج خود یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ شکھا سے ملنے بیوٹی پارلر نہیں جاؤں گی۔ مگر وہ بڑی اچھی ہے۔ میرا جب اُس سے ملنے کو جی کرے گا اُس کے گھر ہو آؤں گی۔''

''یہی میں نے بھی سوچا ہے۔ شکھا جب بھی میرے گھر آئی ہے، مجھے بڑا اچھا لگا ہے۔ ابا اور امّی کو بھی شکھا بہت پسند ہے۔ شکھا نے جانے کیوں یہ کام شروع کر دیا۔ دولت کی تو اُن کے پاس کوئی کمی نہیں۔''

''دولت سی دولت ہے۔'' سیما نے کہا

''ویسے بھی'' شہلا بولی ''ہم لڑکیاں اس ایک جنم میں دو جنمی ہوتی ہیں۔ سال ڈیڑھ سال میں ہم سب کا بیاہ ہو جائے گا۔ جانے کون کہاں جائے گا اور یہ دوستیاں دھری کی دھری رہ جائیں گی۔ مگر جو بات میں کہنا چاہتی ہوں۔ وہ یہ ہے کہ دولت خود میں تو کوئی بری شے نہیں ہے مگر بہت کم مرد اسے پا کر اپنے آپ پر ضبط کر سکتے ہیں اور اسے اپنی ناجائز خواہشات کے حصول کا ذریعہ بنا لیتے ہیں۔ دولت کے فرش نظروں کو خیرہ کرتے ہی ہیں مگر بڑے چکنے ہوتے ہیں جن پر مرد تو دیدہ ودانستہ گرتے ہیں مگر ناسمجھ اور بھولی بھالی لڑکیاں اور عورتیں مردوں کی ترغیب پر اُن پر قدم رکھتی ہیں تو اپنے آپ کو سنبھال نہیں پاتیں۔''

شہلا چپ ہوگئی۔ وہ کچھ جذباتی ہوگئی تھی اور اُس نے ایک انجانی اداسی کا احساس بھی کیا۔ اس کا گھر آ گیا تھا مگر سیما کو اندر جانا نہیں پڑا کیونکہ شہلا کی امّی دروازے کے پردے سے لگی شہلا کی انتظار میں کھڑی تھی اور اُس نے شہلا کو سیما کے ساتھ آتے دیکھ کر اطمینان کا سانس لیا تھا۔ سیما نے شہلا کی امّی کو آداب کہا اور جلد جلد اپنے گھر کی طرف بڑھنے لگی۔

چاندنی محل

چاندنی محل دہلی یا لکھنؤ کی کسی تاریخی عمارت یا حویلی کا نام نہیں تھا بلکہ یہ محمد علی روڈ ممبئ کا ایک مقبول عام ہوٹل تھا۔ اس کا مالک سجاد حسین تھا جس کے بارے میں مشہور تھا کہ کبھی کوٹھوں کے نیچے ایک تھڑے پر چائے بناتا تھا اور خود کیتلی میں بھر کر اور پیالے ہاتھ میں لٹکا کر اوپر لے جاتا تھا مگر جانے قسمت نے کب اور کیسے پلٹا کھایا کہ اب ایک صاحبِ ثروت اور باعزت آدمی تھا۔ یہ ہوٹل صبح نو بجے سے آدھی رات تک کھلا رہتا تھا اور اس میں میز پر بیٹھنے کی جگہ حاصل کرنے کے لیے کچھ دیر کھڑے رہنا پڑتا تھا۔ یہ ایک پرانی وضع کا کشادہ ہوٹل تھا جس میں پچیس میزیں تھیں اور ہر میز کے گرد چار کرسیاں لگی رہتی تھیں جو ضرورت کے مطابق ایک میز سے دوسری میز تک کھسکتی رہتی تھیں۔ اس ہوٹل کے بیرے باوردی، مؤدب اور صاف ستھرے تھے جو مستعدی سے اپنے کام میں لگے رہتے تھے۔ شام کو اس ہوٹل میں غیر معمولی بھیڑ کی وجہ سجاد حسین کا تین سال پہلے لیا ہوا وہ فیصلہ تھا جس کے مطابق ایک اونچے پلیٹ فارم پر دو طرحدار، نازک اندام نوجوان لڑکیاں مائک ہاتھ میں لے کر کبھی بیٹھ کر اور کبھی کھڑی ہو کر غزل اور قوالی گاتی تھیں اور نیچے دو سازندے طبلے اور ہارمونیم پر ان کا ساتھ دیتے تھے۔

ہوٹل کا کام دو شفٹوں میں ہوتا تھا اور ہر شفٹ کے ملازم الگ تھے۔ پہلی شفٹ کا انچارج سجاد حسین کا ایک خالہ زاد بھائی خالد محمود تھا جسے کام کرتے ہوئے اب بارہ سال ہو گئے تھے اور جو بڑا محنتی اور ایماندار ثابت ہوا تھا۔ ہوٹل کے کاروبار کے لیے کم سے کم دو گھر

کے آدمیوں کی ضرورت ہوتی ہے مگر سجاد حسین کے اپنے اکلوتے بیٹے وجاہت حسین نے کبھی ہوٹل کے کام میں کوئی دلچسپی نہیں لی۔ وہ ایک نئی بلڈنگ کنسٹرکشن کمپنی میں پارٹنر تھا اور دوسرے پارٹنروں کے ساتھ دن بھر ادھر سے ادھر گھومتا رہتا تھا۔ اس کام کی نوعیت کچھ ایسی تھی کہ ہر قسم کے آدمیوں سے واسطہ پڑتا تھا اور ہر قدم پر سرکاری افسروں کو رشوت دینا اور خوش کرنا پڑتا تھا۔ وجاہت حسین خود ایک اوباش قسم کا آدمی تھا اور اب جب ہر قسم کا موقع میسر آیا تو وہ شراب بھی پینے لگا تھا۔ اب تک وہ اپنے ابا سے مانگ مانگ کر بغیر کسی خاص منافع کے پیسہ لگاتا رہا تھا مگر وہ اس کام سے مطمئن تھا۔ وجاہت حسین اڑتیس سال کا خوبرو، شادی شدہ آدمی تھا جس کے دو اسکول جانے والے بچے تھے۔ وہ چار لڑکیوں کے بعد پیدا ہوا تھا اور بڑے ناز و نعم میں پلا تھا۔

ہوٹل کے پاس ہی پیچھے گلی خدا بخش میں سجاد حسین کی اپنی دو منزلہ رہائشی عمارت تھی۔ وہ نیچے کی منزل میں اپنی بیوی، ایک مطلقہ بیٹی اور دو نواسوں اور ایک نواسی کے ساتھ رہتا تھا۔ ایک بوڑھا ملازم اور ایک خادمہ بھی تھی۔ وجاہت حسین اوپر کی منزل میں تھا جس کا راستہ بھی الگ باہر کی طرف سے تھا۔ کھانا سب کا نیچے ہی بنتا تھا۔ سجاد حسین کی عمر اب بہتر سے تجاوز کر گئی تھی اور گٹھیا کا پرانا مریض تھا۔ بیوی اس سے بھی زیادہ بیمار تھی اور بمشکل گھر کے اندر ہی تھوڑا بہت چل پھر لیتی تھی۔

جب سجاد حسین کا مرض بہت بڑھ گیا اور چلنا پھرنا اور اٹھنا بیٹھنا زیادہ تکلیف دہ ہو گیا تو سب کی یہ صلاح ہوئی کہ ہوٹل کا کام اب وجاہت حسین سنبھالے اور باپ کی جگہ شام کی شفٹ میں جایا کرے۔ یوں بھی وجاہت حسین کو اپنے کام میں نقصان پر نقصان ہو رہا تھا۔ مگر ذہنی طور پر وجاہت حسین اس کام کو چھوڑنے پر بھی آمادہ نہیں تھا۔ مگر سب لوگوں کے سمجھانے بجھانے پر کہ اگر وہ نہیں مانا تو لاکھوں روپے کا پرانا بزنس تباہ و برباد ہو جائے گا اس نے کنسٹرکشن کمپنی میں اپنی حصے داری ختم کی اور ہوٹل جانے لگا۔

دو تین دن تو وجاہت حسین کا چاندنی محل میں جی نہیں لگا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس نے نظروں کی بجائے ذہن سے زیادہ کام لیا تھا۔ وہ چھ بجے شام کو پہنچ کر اور خالد محمود سے کیش سنبھال کر اپنی کرسی پر بیٹھ جاتا اور اپنے پرانے بزنس کی ہلچل بھری، غیر ہموار زندگی اور تعلقات کے بارے میں سوچنے لگتا حتیٰ کہ سات بجے سے شروع ہونے والی طبلے کی

تھاپ اور نور اور نکہت کی شعلے کی طرح لپکتی ہوئی آوازیں بھی اس کی اس سوچ کو برہم نہ کرتیں۔ بلاشبہ وہ اس اثنا میں بل بھی بناتا اور بیروں کی لائی ہوئی رقمیں بھی وصول کرتا رہتا۔ مگر ایک عجیب سی بندش اور گھٹن کا احساس وہ برابر کرتا رہا۔

مگر ایک دن جب اُس نے اپنے ذہن کی کھلی کھڑکیوں کو بند کرلیا اور آنکھوں کے سارے دریچے کھول دیئے تو وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ چاندنی محل میں تو چاروں طرف رنگینی بکھری پڑی تھی! اس چاردیواری میں تو سارے ممبئی کی جس کی لمبی اور گنجان سڑکیں وہ ناپتا رہا تھا ایک چھوٹی سی نمائندہ تصویر سمٹ آئی تھی۔ وہ اپنی میز سے اُٹھ کر گاہکوں کی میزوں تک بھی جانے لگا، یہ پوچھنے کے لیے کہ انہیں اپنی وہ نشستیں پسند تھیں مگر اس کا حقیقی مقصد کچھ دلکش اور شاداب نسوانی چہروں کو قریب سے دیکھنے کا ہوتا تھا۔

شام کے آٹھ بجے کے بعد تو چاندنی محل واقعی ممبئی کی رات کی زندگی کو اپنی بانہوں میں بھر لیتا اور اس میں بیٹھ کر یہ پتہ بھی نہیں لگتا کہ وقت کب نیم شبی میں ڈھل گیا۔ آنکھیں تازہ ہوتی رہیں تو جسم بھی نہیں تھکتا۔ جیسے ہی شام ہوتی چاندنی محل میں نئے نئے جوڑے داخل ہونا شروع ہوجاتے۔ چونکہ یہ کوئی اعلیٰ سطح کا ہوٹل نہیں تھا۔ عموماً وہ نوجوان جوڑے آتے جو متوسط بلکہ زیرمتوسط طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ وجاہت حسین جانتا تھا اِن طبقوں کی نوجوان لڑکیوں میں جو بات ہوتی ہے وہ اونچے طبقے کی لڑکیوں میں نہیں ملتی۔ اس ہوٹل کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ یہ عشق ومحبت میں مبتلا ان لڑکوں اور لڑکیوں کی آماجگاہ تھی کیونکہ انہیں باہر ملنے ملانے کا ٹھکانہ میسر نہیں آتا۔ کچھ دنوں میں ہی وجاہت حسین یہ محسوس کرنے لگا کہ اُس کا یہ کام تو بہت مسرت آگیں تھی۔ اس کے بالکل قریب اور اس کی میز کے سامنے اتنی حسین اور دل پذیر شکلیں اور ہر روز بدلتی ہوئیں! وہ رات کو کافی دیر سے بھی گھر پہنچتا تو پھول کی طرح ہلکا اور تروتازہ ہوتا اور آنکھوں میں بجلی تصویریں جھلملاتی ہوتیں۔

یا تو وجاہت حسین ہوٹل کا کام کرنا نہیں چاہتا تھا اور یا یہاں اب اُس کا اتنا جی لگ رہا تھا کہ وہ اس کو چھوڑنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ چاندنی محل میں ہر آنے والی لڑکی اور عورت کو اشتیاق آمیز نظروں سے دیکھتا اور بیٹھے بیٹھے ہی ان کے سراپے کا جائزہ لے لیتا۔ مگر یہ کام نظروں سے چوری چھپے کیا جاتا۔ ہاں اگر وہ یہ محسوس کرتا کہ کوئی پارٹی آرام سے نہیں بیٹھی ہے تو وہ اپنی میز سے اُٹھ کر اور اُس کے پاس پہنچ کر یہ پوچھ لیتا کہ

وہ اس کی کیا مدد کر سکتا تھا۔ ایسا عموماً وہ اُس پارٹی کے ساتھ کرتا جس کے ہمراہ کوئی جاذبِ نظر لڑکی ہو اور چاندنی محل میں ایسی پارٹیوں کی تعداد کم نہ ہوتی۔

ایک روز رات کو تقریباً دس بجے ایک جوڑا داخل ہوا اور وجاہت حسین کے بالکل سامنے والی میز پر جو اسی لمحے خالی ہوئی تھی بیٹھ گیا۔ اس کی نظر اس جوڑے پر جم گئی کیونکہ خاتون برقعہ پوش تھی۔ اوّل تو کسی بھی وقت برقعہ پوش عورت اس ہوٹل میں شاذ ہی آتی تھی اور اس وقت تو کبھی نہیں مگر یہ وقت جو کچھ اور ہی قسم کے جوڑوں کا تھا اور نور اور نکہت کو بھی اپنی محفل گرم کیے دو گھنٹے سے زیادہ ہو گئے تھے۔ اس خاتون نے بیٹھتے ہی چہرے کی نقاب الٹ دی اور بجلی کی روشنی میں وجاہت حسین نے دیکھا کہ یہ تو انیس بیس سال کی، گورے رنگ کی شعلہ جوالا لڑکی تھی۔ اس کا ساتھی مرد اگر زیادہ نہیں تو اس سے دگنی عمر کا ہر حالت میں تھا۔ لڑکی کچھ اداس بھی نظر آتی تھی اور ظاہری طور پر کسی غریب گھر کی تھی کیونکہ چاندی کے چھوٹے سے جھمکوں کے سوا وہ کوئی زیور پہنے ہوئے نہیں تھی اور اس کا برقعہ بھی پرانا اور میلا سا تھا۔ بیرا اب اُس میز پر پہنچ گیا تھا اور وہ آدمی کچھ آرڈر دے رہا تھا۔ اتنے میں وجاہت حسین نے کیا دیکھا کہ نور نے اپنی غزل ختم کی تو سیدھی ان کے پاس پہنچی اور دونوں کو دیکھ کر مسکرائی۔ اس آدمی کو تو اس نے ہاتھ اٹھا کر سلام بھی کیا۔ ان سے بات کر کے نور وجاہت حسین کے پاس آئی اور آہستہ سے بولی۔

"وجاہت صاحب یہ میری رشتے کی بہن فریدہ ہے اور اس کے ساتھ اس کے وہ ہیں یعنی میرے بہنوئی آپ ان کا بل بنا کر انہیں نہ بھجوائیں بلکہ اپنے پاس رکھ لیں۔ اس کی ادائیگی میں کروں گی۔ وجاہت حسین کو فریدہ اتنی اچھی لگی تھی کہ وہ اُٹھ کر اُس کو بہت قریب سے دیکھنے کی سوچ رہا تھا مگر اب جو نور اس کے پاس آئی اور اس کے اتنی قریب ہو کر مسکرائی تو وہ بھی اسے بہت اچھی لگی۔ اُس کے چہرے پر کوئی ایسی بات تھی جو کسی بھی آدمی کے سکون کو تہ و بالا کر سکتی تھی۔ نور اپنی جگہ پر پہنچ کر بیٹھ گئی تو وہ سوچنے لگا کہ نور کو تو وہ جب سے ہوٹل میں آنے لگا تھا دیکھ رہا تھا وہ کچھ جھنجھلا سا گیا کہ خدا نے یہ کیا کیا کہ عورت کو اتنا حسین اور مرد کو اتنا کمزور اور مجبور بنا دیا۔ اب دیکھیے نا ایک دن میں کتنی بار کتنے حسین چہرے آس پاس سے گزر جاتے ہیں اور آپ کلیجہ مسوس کر رہ جاتے ہیں۔ پھر یہ بھی کتنی عجیب بات ہے کہ ایک عورت یا لڑکی جو شروع میں آپ کو نہیں کھینچتی کچھ دنوں کے بعد کئی بار دیکھے جانے پر اچھی لگنے لگتی ہے اور آپ اس کو

پانے کی آرزو بھی کرنے لگتے ہیں۔ معاً وجاہت حسین کا خیال اپنی حسین اور نیک بیوی ثمینہ کی طرف چلا گیا اور اس نے اپنی گندی ذہنیت اور سوچ کو لگام دی اور اپنے کام پر لگ گیا۔

فریدہ تو اس کے بعد ہوٹل میں کبھی نہیں آئی مگر ایک روز جب ہوٹل بند ہونے کے بعد نور اس لیے رک گئی کیوں کہ اُسے پانچ سو روپے ایڈوانس کی سخت ضرورت تھی تو وہ وجاہت حسین کے ساتھ کچھ بے تکلف سی ہوگئی اور اس نے وجاہت حسین کے پوچھنے پر اُسے بتایا کہ فریدہ بن باپ کی غریب گھر کی لڑکی تھی اور اس کا کوئی بھائی اور بہن نہیں تھی۔ اس کی ایک چچیری بہن کا شوہر رزّاق جو اس روز اس کے ساتھ ہوٹل میں آیا تھا اس پر ڈورے ڈال رہا تھا۔ نور نے یہ بھی کہا کہ اگر آپ کی بھی فریدہ میں کوئی دلچسپی ہو تو وہ اسے ملوانے کی پوری کوشش کرے گی۔ مگر فی الوقت تو نور اس کے سامنے تھی اور اس نے فریدہ کی بات کسی اور دن کے لیے چھوڑ دی۔ اس نے پانچ سو روپے گنے، نور کے نام لکھے اور سارا کیش سیف میں رکھ کر اور ہوٹل کو تالہ لگا کر نور کے ساتھ ہی نکل گیا۔

سجاد حسین کے زمانے سے ہی یہ طریقہ چلا آرہا تھا کہ آدھی رات کو چاندنی محل کی دن بھر کی آمدنی کو جو ایک کثیر رقم ہوتی گھر لے جانے کی بجائے وہیں گن کر سیف میں محفوظ کر لیا جاتا اور اگلے روز سارا کیش سیدھا بنک میں بھیج دیا جاتا۔ وجاہت حسین بھی اسی طریقے پر چل رہا تھا۔ مگر جہاں سجاد حسین سارا کام سمیٹ کر ٹھیک ساڑھے بارہ بجے گھر پہنچ جاتا تھا وہاں وجاہت حسین ڈیڑھ دو بجے سے پہلے گھر نہ پہنچتا۔ اب ملازمین تو پہلے کی طرح کام ختم کر کے بارہ بجے چھٹی کر لیتے، مگر وجاہت حسین بعد تک بند ہوٹل میں بیٹھا رہتا تھا اور خود باہر کا قفل لگاتا۔ جب وہ اپنی کار میں بری طرح تھکا ہارا رات کو بہت دیر سے گھر آتا اور کپڑے اتارتا اور بغیر بیوی سے بات کیے جو اس وقت بھی شوہر کی انتظار میں جاگی ہوئی ہوتی، پلنگ پر سو جاتا تو ثمینہ چپکے چپکے آنسو بہانے لگی۔ وہ کئی دفعہ تو نشے کی حالت میں بھی گھر آتا تھا۔

نور نے وجاحت حسین کو پوری طرح اپنے جال میں پھنسا لیا تھا اس نے سونے کی زنجیر کے انعام کے لالچ میں فریدہ کو بھی وجاحت حسین سے ملوا دیا اور اس کے ہی ذریعے اس کی دوستی نکہت اور دو تین اور لڑکیوں سے بھی ہوگئی تھی۔ عیاشی کے ان اخراجات کی بنا پر چاندنی محل کی آمدنی بھی نظر میں آنے والی حد تک کم ہوگئی تھی۔ سجاد حسین اگر چہ اب ہوٹل میں نہیں جاتا تھا مگر حساب کتاب پر پورا کنٹرول اُسی کا تھا اور بینک کا سٹیٹمنٹ اُسی کے

پاس آتا تھا۔ اُس نے آمدنی کی اس کمی کو عارضی سمجھ کر کچھ کہنا سننا مناسب نہیں سمجھا۔

ثمینہ نہایت شریف گھریلو عورت تھی۔ اس نے ساس سسر کی خدمت، بچوں کی پرورش اور شوہر کی اطاعت گزاری میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ وہ وجاہت حسین کے طور طریقوں اور شراب نوشی سے پریشان تھی اور وقتاً فوقتاً اس نے اپنی ناراضگی بھی ظاہر کی تھی مگر نہ کبھی واویلا مچایا اور نہ جھگڑا کیا مبادا بات بڑوں تک پہنچے اور گھر سے باہر نکلے۔ مگر جب سے وجاہت حسین نے چاندنی محل جانا شروع کیا تھا اس کی پریشانی کئی گنا بڑھ گئی تھی۔ مگر اسے اپنے خدا پر بھروسہ تھا اور وہ ہر روز دوزانو ہو کر اُس کی بارگاہ میں دعا کرتی کہ میرے مولا میرے شوہر کو راہِ راست پر لے آ۔

ایک روز وجاہت حسین کافی پہلے یعنی سوا بارہ بجے ہی گھر آ گیا۔ اس وقت ثمینہ پوری جاگی ہوئی تھی مگر وجاہت حسین نے اس سے صرف پانی کا گلاس مانگا اور کپڑے بدل کر سونے لگا۔ ثمینہ سے نہ رہا گیا اور وہ اس کے پاس بیٹھ کر بولی۔

"آپ کو کیا ہو گیا۔ مجھ سے بولتے ہیں نہ بچوں سے پیار کرتے ہیں۔ خیر مجھ بدنصیب کو تو چھوڑیئے مگر بچوں کے بارے میں تو پوچھ لیا کیجیے۔"

"ثمینہ ہوٹل میں اتنا کام ہے کہ میں بری طرح تھک جاتا ہوں۔ تم سے بے اعتنائی کی تو میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ تم جانتی ہو کہ میں بچوں سے کتنا پیار کرتا ہوں۔"

مگر وجاہت حسین نے اپنا راستہ نہیں بدلا۔ نور اور نکہت اس کی کمزوری کا فائدہ اٹھا رہی تھیں۔ ایک دن نور نے باتیں بنا کر وجاہت حسین سے دو ہزار روپے ادھار مانگ لیے اور یہ کہہ دیا کہ یہ ایک نجی قرضہ تھا جس کا ہوٹل کی ملازمت سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ یہ قرضہ اس نے نہیں لوٹایا۔ سجاد حسین اب پریشان تھا کہ چاندنی محل کی آمدنی بڑھنے کی بجائے بتدریج گھٹ رہی تھی، باوجود اس کے کہ سارا کیش وجاہت حسین کو سونپا جاتا تھا اور شام کی آمدنی ہمیشہ ڈیڑھ گنی زیادہ ہوتی تھی۔ اس نے پوچھ تاچھ بھی کی مگر غیر تسلی بخش وضاحت کے باوجود چپ رہ گیا کیونکہ کام تو اب وجاہت حسین نے ہی کرنا تھا۔

ایک روز جب چاندنی محل میں وجاہت کی میز کی دراز میں سے پورے پانچ ہزار روپے نکل گئے تو وجاہت حسین بھی گھبرا گیا۔ رات کو نور نے وجاہت حسین سے کچھ کہا اور اسے ہوٹل سے باہر لے گئی۔ وجاہت نور کی بات سنتے ہی لوٹ آیا اور اس نے نور کے

سامنے ہی سرفراز کو جو انگریزی خواندہ بیرا اٹھا کہا کہ وہ کسی ضروری کام کے لیے آدھے پونے گھنٹے کے لیے باہر جارہا ہے اور وہ اس اثنا میں بل بنا کر اپنے اور دوسرے بیروں کے پیسے خود رکھتا رہے اور وہ لوٹ کر لے لے گا۔ یہ کہہ کر وجاہت حسین نے گاڑی کی چابی اٹھائی اور اکیلا باہر نکل گیا۔ وہ جلدی میں کیش والی درازوں کو تالہ لگانا بھول گیا۔ نور نے موقع پا کر پانچ ہزار کی سوسو کے نوٹوں کی ربڑ بینڈ سے بندھی گڈی جو خالد محمود کے دیئے ہوئے کیش کا حصہ تھی تیر کردی اور کچھ دیر کے لیے باہر جا کر کہیں رکھ آئی۔ لوٹ کر اور ہوٹل بند ہونے کے بعد وجاہت حسین نے سب ملازمین کو سامنے کھڑا کر کے پوچھ تاچھ کی اور پولیس کو بلانے کی دھمکی بھی دی مگر بے سود۔ چاندنی محل میں چوری کا یہ پہلا کیس تھا۔

اس چوری کی خبر پہلے خالد محمود اور پھر اس کے ذریعے سجاد حسین تک پہنچ گئی۔ سجاد حسین کے ایک خیر خواہ نے وجاہت حسین کی بے راہ روی کا اشارہ بھی کردیا۔ مگر وہ اس وقت زیادہ پریشان ہوگیا جب اس نے ایک دن ثمینہ کی آنکھوں میں آنسو دیکھے۔ اُس نے ہمیشہ ثمینہ کو گھر کی بہو کی بجائے بیٹی زیادہ سمجھا تھا۔ اُس نے اپنی بیوی سے کہا کہ پیار محبت سے ثمینہ سے بات کر کے معلوم کرے کہ اسے کیا دکھ ہے اور جب اُسے کئی باتوں کا پتہ چلا تو بڑھاپے میں بھی اس کا خون کھولنے لگا اور اس نے یہاں تک کہہ دیا کہ ایسی ناہنجار اولاد سے تو بے اولاد ہونا بہتر تھا۔

اگلے دن جب وجاہت حسین گیارہ بجے اٹھ کر نیچے آیا تو سجاد حسین نے اُسے آواز دی اور اپنے سامنے بٹھا کر بولا۔

"جب سے تم نے میری جگہ چاندنی محل کا کام سنبھالا ہے وہاں کے اور گھر کے حالات بگڑ گئے ہیں۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم اتنے نالائق اور غیر ذمے دار ثابت ہوگے۔ میں نے اپنے ذرائع سے سب کچھ معلوم کرلیا ہے اور مجھے جھوٹی صفائی دینے کی کوشش نہ کرنا۔ اگر تم نہ سدھرے تو میں نہ صرف چاندنی محل کو بیچ دوں گا بلکہ تمہیں بھی بے دخل کردوں گا۔ تم میرے غصے سے ناواقف نہیں ہو۔ گھر میں نیک، خوبصورت اور اطاعت گزار بیوی کے ہوتے ہوئے بھی تم شرمناک حرکتوں پر اتر آئے ہو۔ اپنے اللہ کو کیا جواب دوگے۔ یاد رکھو کہ پاکباز عورت کی آہ طاقتور سے طاقتور آدمی کو بھی برباد کرسکتی ہے۔ خدا رحیم و کریم ہے تو قہار بھی ہے۔"

''ابا جان....''

''خبردار جو کچھ کہنے کی کوشش کی۔ میں آج سے ہی چاندی محل میں گانا بجانا ختم کر رہا ہوں اور نور، نکہت اور سازندوں کو خالد محمود ان کا حساب کر کے آج نکال دے گا۔ تم گناہ میں ملوث ہو اور تمہارے سامنے صرف یہی راستہ ہے کہ تم آج ہی بلکہ ابھی ثمینہ سے معافی مانگو اور سچے دل سے توبہ کر لو۔''

ابا کی یہ بات وجاہت حسین کے سارے وجود کو بری طرح جھنجھوڑ گئی اور اسے معاً محسوس ہوا کہ ابا جان ٹھیک ہی تو کہہ رہے ہیں۔ گناہ کی جس دلدل میں وہ پھنسا جا رہا تھا اس کے انجام کے خیال سے وہ کانپ سا گیا۔ اس کی آنکھوں میں ندامت کے آنسو لرز رہے تھے۔ اس نے فی الفور ابا کے پاؤں پکڑ لیے۔

اس کے چند لمحوں بعد ہی وہ اپنے ابا کے احکام کی تعمیل میں متزلزل سے قدموں سے اوپر چڑھ رہا تھا۔ جب توبہ کے بعد وجاہت حسین نے بھری بھری آنکھوں اور بھرّائی ہوئی آواز سے ثمینہ سے معافی مانگی تو ثمینہ بھی اپنے آنسو ضبط نہ کر سکی۔ اس نے دل ہی دل میں اس مالکِ دو جہاں کا شکر ادا کیا جس نے اس کی دعا قبول کر لی تھی۔

⁂ ⁂ ⁂

کھڑکی

بابو نثار احمد فیض آباد کی میونسپل کمیٹی میں ٹیکس کے محکمے میں کلرک تھے۔ ان کی تنخواہ خاصی تھی۔ محلہ بازی گراں میں اپنے پشتینی مکان میں رہتے تھے اور ان کا شمار، خاص طور پر ان کی ملازمت کی وجہ سے اچھے کھاتے پیتے گھرانوں میں ہوتا تھا۔ اس پرانی وضع کے مقابلتاً چھوٹے شہر میں وہ بھی دوسروں کی مانند خاصے قدامت پسند تھے۔ ان کے تین بچے تھے، دولڑکیاں اور ایک لڑکا۔ لڑکیاں دونوں بڑی تھیں۔ مہ جبین اٹھارہ سال کی تھی اور اسلامی گرلز ہائی اسکول میں دسویں میں پڑھ رہی تھی۔ یہ اسکول میں اس کا آخری سال تھا۔ عام حالات میں مہ جبین کو پندرہ سولہ سال کی عمر میں میٹرک کر لینا چاہیے تھا مگر بابو نثار احمد نے اسے آٹھویں سال میں اسکول میں داخل کرایا تھا اور وہ بھی اپنی بیوی شکیلہ کے کافی اصرار کرنے پر۔ بہرحال اس کی کلاس میں اس کی عمر کی بلکہ اس سے بھی بڑی کافی لڑکیاں تھیں۔ اس کی چھوٹی بہن یاسمین البتہ چھ سال کی عمر میں پڑھنے لگی تھی اور وہ اب نویں جماعت کی طالبہ تھی۔ وہ سولہویں سال میں قدم رکھ چکی تھی۔ لڑکا سلیم چودہ سال کا تھا اور میونسپل ہائی اسکول میں ساتویں جماعت میں پڑھ رہا تھا۔ وہ اس سال فیل ہونے کے سبب ساتویں میں ہی رہ گیا تھا۔

بابو نثار احمد کے گھر میں ٹیلی ویژن نہیں تھا۔ ہاں ایک پرانا فلپس کا ریڈیو مردانے میں ایک میز پر کروشیا سے کاڑھے ہوئے ایک سفید جالی دار کور سے ڈھکا رہتا تھا۔ بابو نثار احمد کی غیر حاضری میں مہ جبین اور یاسمین اس سے سر جوڑے لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن سے نشر

ہونے والے فلمی گانے ہلکی آواز میں سنتی رہتی تھیں اور صرف اپنی امی کے خفا ہونے یا زور سے آواز دینے پر ہی ریڈیو بند کیا جاتا تھا۔ دونوں بہنوں کو نئی نئی فلموں کے گانے سننے کا بہت ہی شوق تھا۔ مہ جبین تو کسی بھی گانے کو دو تین دفعہ سن کر ہی حفظ کر لیتی تھی اور تنہائی میں یہ صرف یاسمین کی موجودگی میں اُسے اسی ڈھنگ سے گا بھی لیتی تھی۔ اس کی آواز میں ایک خاص قسم کی مٹھاس، لوچ اور لپک تھی مگر وہ شاید اپنی اس خوبی سے آگاہ نہیں تھی۔

دونوں بہنوں میں آپس میں بہت پیار تھا اور وہ گھر میں ہر وقت ایک دوسرے سے جڑی رہتی تھیں اور ساتھ ہی سوتی تھیں۔ سلیم ان سے الگ تھلگ رہتا تھا۔ اُسے بابو نثار احمد کے بے جا لاڈ پیار نے کافی بگاڑ دیا تھا۔ اس کا جی پڑھائی میں نہیں لگتا تھا اور وہ اسکول کے بعد سارا دن لڑکوں کے ساتھ ادھر اُدھر گھومتا رہتا تھا۔ اُسے فلم اور ٹی۔ وی دیکھنے کا بڑا شوق تھا اور اسی تلاش میں رہتا کہ وہ کس کے گھر جا کر ٹی۔ وی پر فلم یا فلمی گانوں کا پروگرام دیکھ سکتا ہے اور آج کل تو ٹی۔ وی پر فلمی نوعیت کے پروگراموں کی بھرمار تھی۔ اشتہارات بھی فلمی مناظر کی بنیاد پر ہی بنائے جا رہے تھے اور جب تک کوئی اشتہار ختم نہیں ہو جاتا یہ پتہ ہی نہ لگتا کہ وہ فلم کا منظر نہیں، ایک اشتہار تھا۔

مہ جبین اور یاسمین نے بھی کئی بار دوسروں کے یہاں ٹی۔ وی دیکھا تھا اور ان کی بھی دلی خواہش تھی کہ ان کے گھر میں بھی ٹی۔ وی آجائے۔ فیض آباد میں جن گھروں میں ٹی۔ وی تھا ان کی تعداد ہر روز بڑھ رہی تھی۔ بابو نثار احمد کے اپنے محلے میں کسی نے کیبل ٹی۔ وی بھی شروع کر دیا تھا مگر اس کے لگوانے اور سو روپے مہینہ فالتو خرچ کرنے کی بہت سے گھروں نے اس لیے ضرورت محسوس نہیں کی کہ اپنے ملک کا ٹی۔ وی بھی اب مغربی ذہنیت بلکہ مخرب الاخلاق پروگراموں کے دکھانے میں ان سے ایک قدم آگے نہیں تو پیچھے بھی ہرگز نہیں تھا۔ بہر حال ٹی۔ وی پر اپنے پروگرام دکھائے جائیں یا بیرونی ممالک کے، یہ بند گھروں میں بھی ایسی کھلی کھڑکی تھی جس میں سے جو چاہے اور جب چاہے اپنی پسند کا منظر مکمل تنہائی میں دیکھ سکتا تھا!

فیض آباد میں دو سنیما گھر تھے اور نشاط ٹاکیز تو بابو نثار احمد کے گھر سے صرف دو فرلانگ کے فاصلے پر تھا۔ مگر بابو نثار احمد کو مستورات اور نوجوان لڑکیوں کے ساتھ سنیما ہال میں جانا اچھا نہیں لگتا تھا چاہے مستورات اور لڑکیاں برقعے میں ہی کیوں نہ ہوں۔ ہاں عید

کے موقع پر وہ ضرور کوشش کرتے کہ گھر والوں کو پکچر دکھادیں۔ عام طور پر سنیما گھروں کے مالکان کوشش کرتے ہیں کہ عید کے دن کوئی اسلامی یعنی اسلامی موضوع پر پکچر لگادیں مگر اس موضوع پر مسلمان پروڈیوسر بھی اب کوئی پکچر نہ بناتے کیونکہ جنس اور تشدد کا دور تھا اور انہیں مجبوراً گھسی پٹی پرانی پکچر لگانی پڑتی مگر بعد میں شکایت کرتے کہ ہال خالی گئے کیونکہ عید والے دن بھی فیض آباد کے لوگ لکھنؤ میں ان نئی پکچروں کو دیکھنے چلے جاتے جن کے گانوں کی دھوم مچی ہوئی تھی۔ مگر بابو نثار احمد اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ اور خاص طور پر جوان یا جوان ہوتی ہوئی لڑکیوں کے ساتھ آج کل کی نئی فلموں کو دیکھنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ پھر فیض آباد کے سنیما گھر تو اوباش لوگوں کے اڈے تھے۔ اس کے علاوہ ہال میں اگلی صفوں میں بیٹھے ہوئے تماشائی موقع بے موقع سیٹیاں بجاتے اور ہیروئن اور دوسری اداکاراؤں پر نازیبا فقرے کستے۔ یہ عمل سنیما ہال کے اندرونی ماحول بلکہ تفریح اور روایت کا ناقابلِ اعتراض اور بے ضرر حصہ سمجھا جاتا تھا!

ایسا نہیں تھا کہ گھر میں ٹی۔وی کے آنے سے پہلے مہ جبین، یاسمین اور سلیم نے فلمیں نہیں دیکھی تھیں۔ سال میں والدین کے ساتھ ایک یا دو فلمیں عید کے موقع پر سنیما ہال میں دیکھنے کا اتفاق تو ہو ہی جاتا تھا اور اس کے علاوہ کبھی رشتے داروں اور واقف کار لوگوں کے یہاں ٹی۔وی یا وی۔سی۔آر پر آج کل کی نئی نئی فلمیں جن میں ہوش اڑا دینے والے منظر ہوتے ہیں اور اداکارائیں برائے نام کپڑے پہنتی ہیں، پوری یا آدھی دیکھنے کا موقعہ بھی مل جاتا تھا۔ مگر ایسے مواقع تعداد میں بہت کم تھے مگر جو بھی تھے انہوں نے ان تینوں کے شوق اور تجسس کو زیادہ تیز کر دیا تھا۔

بچوں یا نوجوانی کی دہلیز میں قدم رکھنے والے کمسن دلوں کے لیے یہ کمبخت فلمیں بھی کیا جادوئی کیفیت رکھتی ہیں! مہ جبین اور یاسمین تو خیر ایک قدامت پسند مسلم گھرانے کی لڑکیاں تھیں جن کے آنے جانے پر ہزار پابندیاں تھیں اور وہ اپنے شوق کے چنچل قدموں کو ضبط اور تحمل کی مضبوط ڈوری سے کس کر باندھے رکھتیں مگر سلیم آزاد تھا اور وہ ادھر ادھر جا کر ٹی وی پر ضرور کوئی فلم یا فلمی گانوں کا پروگرام دیکھ آتا۔

جب پڑوس میں صرف تین گھر چھوڑ کر بابو مقبول حسین کے یہاں بھی ٹی وی لگ گیا اور وہ بھی کلر تو اس کا گلی میں کافی چرچا ہوا۔ بابو مقبول حسین نے اپنا ٹی وی یا تو رفاہ عام کی

خاطر یا ظاہری نمود کے لیے اپنی بیٹھک میں لگوا لیا اور جب ٹی وی چلتا تو گلی کی طرف کھلنے والا دروازہ کھول دیا جاتا تھا۔ یوں بھی بیگم مقبول حسین کافی ملنسار تھیں۔ انہوں نے اڑوس پڑوس میں جب چاہیں آنے اور ٹی وی دیکھنے کا کھلا بلاوا دے دیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سرِشام ہی بچوں اور کچھ مردوں اور عورتوں کی بھیڑ لگ جاتی۔ جن سے میل ملاحظہ زیادہ تھا وہ تو اندر ہی آ کر کرسیوں اور دری پر بیٹھ جاتے مگر باقی کے جن میں بچوں کی اکثریت ہوتی چبوترے پر چڑھ کر کھلے دروازے میں کھڑے ہو کر دیکھتے۔ ان تماشائیوں میں البتہ بابو نثار احمد کے گھر کی مستورات نہ ہوتیں۔

ایک روز بابو نثار احمد دفتر سے کافی دیر میں آٹھ بجے کے بعد لوٹے کیوں کہ انہیں کام پورا کرنے کے لیے اپنے افسر کے حکم سے دیر تک بیٹھنا پڑا تھا۔ گلی میں داخل ہوئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ان کا سلیم، بابو مقبول حسین کی بیٹھک کے دروازے پر کھڑے محلے والوں کی بھیڑ میں گھسا ہوا اندر ٹی وی پر آتی ہوئی فلم دیکھ رہا تھا انہوں نے اسے آواز بھی دی مگر اس کی آنکھیں اور کان تو فلم کے ایکشن اور مزیدار مکالموں پر لگے ہوئے تھے۔ انہوں نے گھر پہنچ کر شکیلہ سے اس کا ذکر کیا تو وہ بولی:

''مجھ سے پوچھ کر گیا تھا۔ بچہ ہے اس کے شوق کو دبانا ٹھیک نہیں۔ دیکھیے جی یہ تو ہر روز کا معاملہ ہے۔ مجھے تو اپنے بچوں کا کسی کے گھر جا کر فقیروں کی طرح ٹی وی دیکھنا پسند نہیں۔ میں کب سے کہہ رہی ہوں کہ ٹی وی خرید لیجیے۔ مقبول حسین سے تو آپ کی حیثیت بڑی ہے۔''

''میں تو مہ جبین کی شادی کے لیے پیسے جوڑ رہا تھا۔ مگر تم اتنا کہہ رہی ہو تو سوچتا ہوں۔''

''اس میں سوچنے کی کیا بات ہے۔ مہ جبین کی شادی کا آدھا سامان تو میں نے جٹا رکھا ہے۔ جب تک لڑکا دیکھو گے اور شادی ہو گی، سارے کام پورے ہو جائیں گے۔ اور ہاں کوئی کالا اور سفید ٹی وی لا کر نہ رکھ دیجیے گا۔ بچوں کو تو کلر ٹی وی چاہیے۔ ہزار دو ہزار کم پڑیں تو میں دے دوں گی۔''

''مگر کلر ٹی وی تو بارہ تیرہ ہزار سے کم کا نہیں آئے گا۔'' بابو نثار احمد کچھ گھبرا کر بولے۔

"تو کیا ہوا۔ چیز بار بار نہیں لی جاتی۔ خریدنے سے پہلے بھائی جان سے بھی صلاح کر لیجیے گا۔ انہوں نے اپنے کلرٹی وی کے لیے پہلے صرف چھ ہزار روپے دئے ہیں اور باقی آسان قسطوں میں ادا کریں گے۔ کل یا پرسوں لے آئیے۔ سنا ہے قیمت اور بڑھے گی۔"

کل یا پرسوں میں تو نہیں مگر چھ سات دن میں بابو نثار احمد کے گھر میں نیا کلرٹی وی آ گیا۔ ٹی وی شام کے سات بجے کے قریب آیا اور دکان دار کے آدمی نے گھر والوں کی ہدایت کے مطابق گھر کے اندرونی بڑے کمرے میں اسے ایک چھوٹی سی میز پر لگا دیا اور چھت پر اینٹینا لگا کر سب کو جھپاتے ہوئے پروگرام دکھا دیے۔ لکھنؤ کے علاوہ یہ ٹی وی دلّی کے پروگرام بھی صاف پکڑ رہا تھا۔ سارا گھر خوشی سے ناچ اٹھا۔ اتنی خوشی تو شاید بچے کی پیدائش اور بیاہ شادی کے موقع پر بھی نہ ہوتی ہو۔ چشم زدن میں کبھی دلّی اور کبھی لکھنؤ لگا دیتے۔ ٹی وی کے ساتھ ریموٹ کنٹرول بھی تھا جسے سلیم کے ہاتھ میں دے دیا گیا اور ٹی وی کو شروع کرنے، بند کرنے یا چینل بدلنے کے لیے اب اٹھنے کی بھی ضرورت نہیں تھی۔ رات کو کوئی بھی نہیں اٹھا اور کھانا بھی ٹی وی کے سامنے کھایا گیا۔ دلّی کے پروگرام تو رات کے بارہ بجے تک آتے رہے اور اس وقت تک کسی نے آنکھ بھی نہیں جھپکی!

بابو نثار احمد کا تو ایک دو دن میں ہی شوق پورا ہو گیا۔ اس کے علاوہ انہوں نے یہ محسوس کیا کہ یہ سارے پروگرام صرف نوجوانوں کے لیے ہیں۔ خبریں وہ ضرور سن سکتے تھے مگر اخبار میں خبریں پڑھنے کا جو مزہ آتا تھا وہ کچھ اور ہی تھا۔ ہاں شکیلہ، بچوں کے ساتھ پانچ چھ دن شوق میں بیٹھی رہی مگر پھر اسے پتا لگ گیا کہ آج کل کی فلمیں وہ بچوں کے ساتھ بیٹھ کر نہیں دیکھ سکتی تھی۔ پھر اس کی خانگی ذمے داریاں بھی بہت تھیں۔ دونوں وقت کا کھانا بنانا، کپڑے دھونا اور سارے گھر میں جھاڑو بہاری کرنا اسے فرصت ہی کہاں دیتا تھا۔ اس نے مہ جبین کو سکھا تو سب کچھ دیا تھا اور وہ بھی ماں کا ہاتھ بٹانے یا خود ہی سارا کام کرنے کے لیے آمادہ رہتی مگر شکیلہ یہ سوچ کر اس سے زیادہ کام نہ لیتی کہ شادی کے بعد تو ساری عمر اسے یہی چولہا جھونکنا ہے، ماں باپ کے گھر میں جو آرام مل جائے ٹھیک ہے۔

اب ٹی وی سے چپکے رہتے ہیں تو مہ جبین، یاسمین اور سلیم۔ رات کو اس وقت تک جب تک فلمی نوعیت کا آخری پروگرام چلتا رہتا وہ اٹھنے کا نام نہ لیتے۔ ماں باپ تو کب کے سو گئے ہوتے۔ سلیم کی پڑھائی اب نہ ہونے کے برابر تھی اگرچہ مہ جبین اس پر

نگرانی رکھتی اور اسے ٹوکتی رہتی۔ وہ کئی دفعہ یہ بھی محسوس کرتی کہ ہماری فلمیں اور ٹی وی پروگرام اتنے گندے ہو گئے تھے کہ انہیں دیکھ کر کوئی بھی غلط راہ پر چل سکتا تھا، خاص طور پر لڑکے جو باہر گھومتے پھرتے تھے۔ مگر ٹی وی دیکھنا تو سلیم کی عادت ہو گئی تھی اور وہ کسی کے ٹوکنے کی پروا نہیں کرتا تھا۔

سالانہ امتحان کے نتیجے نکل آئے تو جیسا کہ ڈر تھا سلیم پھر فیل ہو گیا اور ساتھ ہی بابو نثار احمد کو اسکول کے ہیڈ ماسٹر کی یہ تحریری تنبیہہ مل گئی کہ اگر سلیم تیسری بار بھی ساتویں میں فیل ہو گیا تو اسے اسکول سے نکال دیا جائے گا۔ سلیم کے دوسرے سال بھی فیل ہو جانے پر سارا گھر پریشان ہو گیا اور بابو نثار احمد نے تو اس روز اُس کی پٹائی بھی کر دی۔

کچھ ہی دنوں میں لڑکیوں کا نتیجہ بھی آ گیا۔ یاسمین پاس ہو گئی مگر اس کے نمبر صرف 35 فیصد تھے۔ مہ جبین کا تو بورڈ کا امتحان تھا اور وہ سیکنڈ ڈویژن میں پاس ہو گئی تھی مگر نمبر صرف پچاس فی صد تھے۔ سلیم کے فیل ہو جانے کی وجہ سے کئی دنوں تک بچوں کو ٹی وی چلانے کی بھی ہمت نہیں ہوئی۔ مہ جبین میٹرک پاس کر کے اب بالکل ہی گھر بیٹھ گئی تھی کیوں کہ فیض آباد میں لڑکیوں کا کوئی الگ کالج نہیں تھا۔ شہر میں صرف ایک ڈگری کالج تھا جس میں تین سو سے زائد لڑکوں کے ساتھ صرف پانچ سات لڑکیاں پڑھتی تھیں اور وہ بھی لڑکوں کے بے ہودہ ہنسی مذاق کا نشانہ بنتی رہتی تھیں۔ بابو نثار احمد تو تھے ہی پرانے خیالات کے، جوان جہاں لڑکی کو کالج بھیج کر خطرہ مول لینے کو تیار نہیں ہوئے۔

دونوں بچے سلیم اور یاسمین اسکول جانے لگے تو حالات پھر معمول پر آ گئے اور چوں کہ مہ جبین کے پاس وقت بھی بہت تھا، وہ پھر دن رات ٹی وی دیکھنے لگی۔ اسکول سے لوٹ کر یاسمین بھی اس کا بھرپور ساتھ دیتی۔ ہاں، سلیم کے لیے اس کے ہی کلاس ٹیچر کی ٹیوشن لگا دی گئی تھی اور وہ اسے مردانے میں ہر روز ایک گھنٹہ ریاضی اور انگریزی پڑھا دیتا مگر وہ گھنٹہ وہی ہوتا جب اندر ٹی وی پر فلم چل رہی ہوتی اور سلیم کی آنکھیں اور ہاتھ تو کاپی کتاب پر ہوتے مگر سارا ذہن پکچر کی طرف لگا ہوتا۔ ماسٹر جی کے جاتے ہی وہ بغیر اپنی کتابیں اور کاپیاں اٹھائے دوڑ کر جاتا اور ٹی وی کے سامنے جم جاتا۔

مہ جبین کو ایک شوق اور ہو گیا تھا۔ وہ اپنی کاپی میں حقیقی اور خیالی سہیلیوں کو محبت بھرے خط لکھنے لگی جو کبھی پوسٹ نہ ہوتے اور کاپی اس کے ایسے خطوط سے بھرنے

لگی۔ ان خطوط میں وہ اردو کے اشعار بھی جگہ جگہ استعمال کرتی اور ان سے خطوط میں سموئے اس کے اپنے جذبات کی شدت اور اجاگر ہو جاتی۔ اس کاپی کو وہ یاسمین سے بھی چھپا کر اپنی الماری میں بند رکھتی۔

مہ جبین کچھ دنوں سے فلم ایکٹریسوں اور اشتہاروں میں کام کرنے والی ماڈل لڑکیوں کو دیکھ کر یہ سوچنے لگی تھی کہ ان کے چہرے تو چاند کے ٹکڑے ہیں اور وہ انتہائی پرکشش جسموں کی مالک تھیں۔ وہ یہ سوچ کر احساس کمتری میں مبتلا ہو جاتی اور آئینہ اٹھا کر بار بار اس میں اپنا چہرہ مختلف زاویوں سے دیکھتی۔ وہ اپنے معمولی کپڑوں میں ڈھکے چھپے جسم پر بھی نیچے سے اوپر تک نظر ڈالتی مگر پرکھنے کو پاؤں کے سوا اور کچھ نہ دکھائی دیتا!

مہ جبین یہ نہ سمجھ سکی کہ چھوٹے یا بڑے پردے پر نظر آنے والی وہ سیم تن لڑکیاں اپنی حقیقی زندگی اور اصلیت میں اس سے نصف بھی حسین اور دلکش نہیں تھیں۔ بھاری میک اپ اور عریانیت سے لدی ہوئی وہ لڑکیاں تو محض نمائشی گڑیاں تھیں جو شہرت اور دولت کی خاطر کچھ بھی کر سکتی تھیں۔ مہ جبین تو واقعی معنوں میں حسین تھی۔ موتیوں کی سی آب والا گورا رنگ، بے عیب، بہت ہی متناسب دلکش خدوخال اور لمبا جاذب نظر قد۔ پھر عمر کی وہ شیریں اور سحر آگیں منزل جہاں حسن بیدار ہو کر سو سو رنگ بدلتا ہے۔ ہاں، اس کا چہرہ ہر قسم کی مصنوعی آرائش سے البتہ بے نیاز تھا۔ اس کے معاشرے کی لڑکیاں میک اپ شادی کے بعد ہی کرتی تھیں۔ ہاں، کسی خاص جگہ یا کسی تقریب وغیرہ میں جانا ہوتا تو لڑکیاں چوری چھپے ہلکا سا پاؤڈر لگا لیتیں اور ہونٹوں کی ہلکی دل پذیر لالی تو پان کا ٹکڑا مہیا کر دیتا۔

ایک دفعہ جب ان کی امی چھت پر کچھ کام کر رہی تھیں اور نیچے جلد آنے کی امید نہیں تھی اور گھر میں وہ دونوں تنہا تھیں، تو انہوں نے امی کی لپ اسٹک ہونٹوں پر لگا لی مگر تھوڑی دیر تک آئینے میں ہنسنے کے بعد گھبرا کر ایک کپڑے سے اچھی طرح پونچھ دی تھی۔ مہ جبین کو تو اپنے گلابی اور بھرپور ہونٹ لپ اسٹک کے ساتھ بڑے عجیب سے اور غیر قدرتی لگے تھے مگر یاسمین پر اس کے سانولے رنگ کے باوجود لپ اسٹک بڑی اچھی لگی تھی اگرچہ یہ اور بات تھی کہ وہ اسے لگاتے ہی پوری عمر کی جوان لڑکی لگنے لگی تھی!

مہ جبین کا نوجوان لڑکوں سے واسطہ برائے نام تھا۔ جب اسکول جایا کرتی تھی تو برقع اوڑھ اور وہ اسکول لڑکیوں کا تھا جس کی دیواریں قلعے کی مانند اونچی تھیں۔ رشتے

داری میں لڑکے کم ہی تھے اور زیادہ تر شادی شدہ تھے اور ان کا آنا جانا بھی بہت ہی کم تھا۔ مگر اب جن نوجوان لڑکوں سے اس کا واسطہ تھا وہ فلموں اور سیریلوں میں کام کرنے والے ہیرو اور دوسرے کردار تھے جو دن میں کئی بار اس کے ٹی وی پر آ کر اس کا دل گدگدا جاتے تھے اور وہ ان کے بارے میں سوچتی رہ جاتی تھی۔ غنیمت تھا کہ وہ غیر اصلی تھے یعنی جسمانی طور پر اس کے کمرے میں موجود نہیں ہوتے تھے، یعنی ان سے مہ جبین کو کسی قسم کی چھیڑ چھاڑ کا خدشہ نہیں تھا۔ نہ اسے ان کے سامنے ان کی نہایت نازیبا حرکتوں سے جو وہ پردے پر کرتے تھے، نظریں چرانے یا شرم سے نیچی کرنے کی ضرورت تھی۔ لیکن پھر بھی وہ گوشت پوست کے بنے کتنے حقیقی نظر آتے تھے اور ان کی وہ حرکتیں جیسے اس کے سامنے اسی کمرے میں ہو رہی تھیں!

اب مہ جبین نے اپنی کاپی میں محبت بھرے خطوط رقم کرنے کے شوق کو ایک نیا موڑ دے دیا۔ اس نے اپنے ذہن سے اپنا ایک خیالی محبوب گھڑ لیا اور اس کا نام جاوید رکھ دیا! پھر اس نے اسے طویل محبت نامہ لکھ دیا۔ اگلے دن ایک اور خط اور اس سے اگلے دن پھر ایک اور۔ ایک دن وہ خود ہی شرمساری ہوگئی اور قدرے خوفزدہ بھی کہ وہ کیا کر رہی تھی۔ اگر چہ وہ اپنی یہ کاپی اپنی الماری میں اپنی کتابوں کے پیچھے بڑا چھپا کر رکھتی تھی مگر اس امکان کے بارے میں سوچتے ہی کہ کبھی ابا کی نظر اسی پر پڑ سکتی ہے، وہ کانپ سی گئی۔ اف توبہ وہ یہ کس راستے پر چل پڑی تھی!

جوانی دیوانی کی کہاوت بڑی پرانی ہے۔ مہ جبین رات کو توبہ کرتی اور صبح وہ توبہ کانچ کے ٹکڑے کی طرح ٹوٹ جاتی۔ پھر وہی دن بھر ہیجان انگیز فلمی گانے اور مناظر اور اس کا ذہن اتھل پتھل ہوتا رہتا۔ کچھ تو سر اٹھاتی جوانی اور کچھ اس کی تنہائی بلکہ بے کاری۔ کبھی کبھی تو وہ ایک اضطراب اور کرب کے عالم میں رات کو بستر میں ایک احساس تحفظ میں سوتی ہوئی یاسمین پر اپنا بازو رکھ دیتی اور اسے اپنے قریب کھینچ لیتی۔

ایک روز موسم بڑا خوشگوار تھا۔ آسمان پر سرمئی گھٹا چھائی ہوئی تھی اور اس کے دامن سے اترتا ہوا اندھیرا آنگن اور کمروں میں بھر گیا تھا۔ بڑی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی اور ایسا لگتا تھا کہ کبھی بھی بارش چھم چھم کر کے گر پڑے گی۔ سلیم اور یاسمین اسکول جا چکے تھے۔ مہ جبین نے آج صبح صبح امی کے رات کو صابن کے پانی میں بھگو کر چھوڑے ہوئے

سارے کپڑوں کو دھوڈالا تھا اور چوں کہ آنگن میں اور چھت پر سکھانا اس موسم میں ممکن نہیں تھا، ماں اور بیٹی برآمدے میں ایک رسّی باندھ کر اس پر کپڑے پھیلا رہی تھیں۔ شکیلہ، مہ جبین کو یہ کہہ کر کہ اپنے کمرے کی کھڑکی کھول دے تا کہ ہوا سیدھی کپڑوں کو لگے، باورچی خانے میں کام کرنے چلی گئی۔

مہ جبین کے کمرے کی کھڑکی بند رہتی تھی مگر آج موسم بھی اچھا اور امی کی ہدایت بھی ٹھیک تھی۔ اس نے کنڈی کھول کر اور بہت زور لگا کر کھڑکی کے دونوں پٹ کھول دیے۔ تیز ہوا کے کئی جھونکے اسے دھکا سا دیتے ہوئے اور چیختے ہوئے سے اندر گھس آئے۔ یہ کھڑکی بنا سلاخوں کی تھی۔ مہ جبین نے اپنی صراحی دار گردن کو ذرا آگے کر کے دیکھا تو سامنے والی حاجی سلامت اللہ کے مکان کی کھڑکی میں سے ایک نوجوان حسین لڑکا اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ دونوں کی نظریں ملیں اور پہلے تو وہ مارے حیا کے پیچھے ہٹ گئی مگر چشم زدن میں ایک زخمی ناگن کی طرح بل کھاتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔ لڑکا کھڑکی کے سامنے کچھ اس طور پر کھڑا تھا کہ وہ اس کے سارے کمرے بلکہ برآمدے میں سوکھتی ہوئی اس کی شلواروں کو بھی دیکھ سکتا تھا۔ چند لمحوں تک برآمدے کے ایک کونے میں چھپ کر کھڑے رہنے کے بعد اور اس یقین کے ساتھ کہ لڑکا اب کھڑکی میں نہیں ہوگا وہ کمرے میں گھسی مگر جھنجلا کر نکل آئی کیوں کہ وہ لڑکا وہیں کھڑا تھا اور اب انتہائی بے شرمی سے اپنے بالوں میں کنگھی کر رہا تھا اور مہ جبین کو دیکھتے ہی وہ ایک اوچھی مسکراہٹ اپنے ہونٹوں پر لے آیا تھا۔

مہ جبین کو اس لڑکے پر بہت غصہ آیا۔ جب وہ کافی دیر تک بھی کھڑکی سے نہیں ہٹا تو مہ جبین نے کمرے کی داہنی دیوار کے ساتھ ساتھ چل کر، بغیر اپنا چہرہ کھڑکی میں کیے دونوں ہاتھ بڑھا کر کھڑکی کو زور سے بند کر دیا۔

مہ جبین کئی دن تک اس لڑکے کے بارے میں سوچتی رہی، کبھی غصے سے، کبھی دلچسپی سے اور کبھی بے دلی سے۔ جب وہ ٹی وی پر کوئی فلمی پروگرام دیکھتی تو وہ یہ جاننے کی کوشش کرتی کہ اس لڑکے کی شکل کس اداکار سے ملتی تھی اور اس کی سوچ نے اس کی شکل ایک نئے خوبرو ہیرو سے ملوا دی۔ اسے اپنے بے کار ذہن کی اس بے معنی مشق میں ایک عجیب سا لطف آیا۔ مزید دو تین دن کے بعد اس نے اپنے کمرے کی تنہائی میں اپنی کاپی میں اس اجنبی لڑکے کو، جس کا نام اس نے عرفان رکھ دیا تھا، ایک طویل محبت بھرا خط لکھ دیا، مگر پھر خود ہی

نادم ہو کر اس نے یہ خط کاپی میں سے نکال کر ٹکڑے ٹکڑے کر کے پھینک دیا۔

ایک روز ایک دکان پر اس کی اس لڑکے سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ جب شکیلہ مشین چلانے بیٹھی تو اُسے پتا لگا کہ سفید دھاگے کی ریل تو ختم ہو گئی تھی۔ مہ جبین کو بھی سویٹر بننے کی سلائیاں خریدنی تھیں۔ وہ امی سے پوچھ کر اور برقع اوڑھ کر پاس ہی میاں افضل کی بساطی کی دکان سے یہ چیزیں لانے کے لیے نکل پڑی۔

دکان پر اس وقت بوڑھے افضل کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ اس نے دکان پر پہنچ کر چہرے پر سے نقاب اٹھا دی تھی۔ جانے کس وقت وہ لڑکا بھی اس دکان سے کوئی چیز خریدنے کے لیے اس کے برابر آ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ مہ جبین نے کسی دوسرے کی آواز اپنے برابر میں سن کر غیر ارادی طور پر مڑ کر دیکھا تو دونوں کی نظریں چار ہو گئیں۔ ''اوئی اللہ یہ تو وہی ہے'' مہ جبین نے گھبرا کر اپنے دل میں کہا اور فوراً نقاب گرا لی۔ اس نے پیسے دیے، چیزیں اٹھائیں اور واپس گھر کی طرف ہو لی۔

چند ہی قدم چلنے کے بعد مہ جبین کو محسوس ہوا کہ وہ لڑکا بھی اس کے پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔ اسے کچھ ڈر سا لگا اور وہ تیز چلنے لگی۔ جب وہ اپنی گلی میں گھسی جہاں اس وقت کوئی آدمی نہیں تھا تو اس لڑکے نے اس کے بالکل قریب آ کر کہا:

''میرا نام ارشد ہے۔ میں نے جب سے تمھیں کھڑکی میں دیکھا ہے اپنے ہوش وحواس کھو بیٹھا ہوں۔ خدارا کوئی ملاقات کی صورت نکالیے۔''

مہ جبین چلتی رہی اور وہ لڑکا بھی جواب کی امید میں ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ ایک دفعہ تو اس کے جی میں آیا کہ وہ وہیں رک کر اسے پھٹکار لگا دے مگر کچھ سوچ کر اس نے سرِ عام اس عمل کو شرافت سے بعید اور باعث بدنامی سمجھا۔ وہ تیزی سے بڑھ کر اپنے گھر میں گھس گئی۔ اس نے اپنی امی کو ریل دی، برقع اتارا اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اس کا سانس تیزی سے چل رہا تھا۔ وہ اپنے پلنگ پر لیٹ گئی اور چھت کی طرف خالی خالی نگاہوں سے دیکھنے لگی۔ وہ اس لڑکے کی ہمت پر حیران تھی کہ اس نے اس کی ہی گلی میں اس کا پیچھا کیا۔ ساتھ ہی وہ اپنا بھی محاسبہ کرنے لگی اور اس نتیجے پر پہنچی کہ کچھ عرصے سے اس کا دل بھی کچھ بھٹک سا رہا تھا۔ وہ شاید دن رات ٹی وی کے واہیات پروگراموں کو دیکھ کر ان سے اثر قبول کر رہی تھی اور اس کی سوچ ایک غلط راستے پر چل پڑی تھی۔ اس خیال کے آتے ہی وہ

کچھ شرمساری ہوگئی اور اپنے ابا اور امی کے بارے میں سوچنے لگی جو اس کے لیے اچھے سے اچھا لڑکا دیکھنے میں لگے ہوئے تھے۔

مہ جبین کی سوچ نے تیزی سے کروٹ لی اور اس نے اپنے ذہن سے کئی منفی جذبوں کو جھٹک دیا۔ آج کے انتہائی ترقی یافتہ سائنسی دور میں نہ ٹی وی سے مفر ممکن تھا، نہ فلموں سے مگر یہ تو ہمارے ہاتھ میں تھا کہ کیا دیکھیں اور کتنا دیکھیں۔ مہ جبین نے یہ بھی فیصلہ کیا کہ وہ گھر کے کام میں امی کا پورا ہاتھ بٹا کر اپنے آپ کو مصروف رکھے گی اور پوری کوشش کرے گی کہ پانچوں وقت کی نماز پڑھے۔

مہ جبین تیزی سے اٹھی اور اس نے اپنی الماری میں سے وہ کاپی نکال لی جس میں اس نے رومانی نوعیت کے خطوط لکھ رکھے تھے۔ اس نے اسے اچھی طرح پھاڑ کر باہر کوڑے دان میں ڈال دیا۔ واپس کمرے میں آ کر اس نے کھڑکی کی طرف دیکھا جو اسی روز سے بند تھی مگر اس کی کنڈی نہیں لگی تھی۔ اس نے آگے بڑھ کر اس کی کنڈی اچھی طرح سے لگا دی !

ایک ہی راستہ

بمبئی میں مہتہ جی جمشید جی روڈ پر سارنگ اینڈ کمپنی کا دفتر تو کافی بڑا تھا مگر سیکنڈ فلور پر اس کی امپورٹ سیکشن میں صرف آٹھ افراد کام کرتے تھے۔ ان میں پانچ مرد اور تین عورتیں تھیں۔ سیکشن کا انچارج ایک ادھیڑ عمر کا شادی شدہ مدراسی راماناتھن تھا۔ وہ اپنی پیشانی پر چندن کا تین متوازی لکیروں کا ٹیکہ لگا کر دفتر آجاتا اور کام میں جٹ جاتا۔ لیکن وہ بالکل خشک بھی نہیں تھا اور سیکشن میں کوئی ہنسی مذاق کی بات ہو جاتی یا کوئی گرما گرم سیاسی خبر کا ذکر ہو جاتا تو وہ اس میں برابر شریک ہوتا۔ ہاں وہ نوجوان لڑکیوں سے آنکھ ملانے اور زیادہ بات کرنے میں ہچکچاتا تھا کیونکہ وہ تجربے کار تھا اور اس عمر میں خواہ مخواہ اپنے ذہن میں کسی بھی قسم کی اُتھل پتھل پیدا کرنے کو عقلمندی نہیں سمجھتا تھا۔ وہ خاص طور پر رشمی کی طرف تو آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا تھا کیونکہ وہ دل و دماغ میں ہیجان بپا کر دینے کی حد تک حسین تھی، نوعمر تھی اور بے حد چلبلی تھی۔ اسے دیکھ کر کسی بھی مرد کے دل میں کھلبلی مچانے والے خیالات فوراً پیدا ہو سکتے تھے۔

راماناتھن کے علاوہ چندن بالی بھی شادی شدہ تھا۔ وہ کوئی تیس سال کا تھا اور کام کرنے کے علاوہ سگریٹ پینے اور بار بار پان کھانے میں مست رہتا تھا۔ چونکہ وہ جوان تھا، اپنے آس پاس نوجوان لڑکیوں کو بیٹھا دیکھ کر کچھ جذبات اس کے دل میں بھی مچلتے تھے، مگر وہ ایک عملی آدمی تھا اور اپنا آگا پیچھا دیکھ سکتا تھا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جو اپنے موقعوں کو

ہتھیلی پر رکھ کر آنک لیتے ہیں اور نتیجے پر پہنچنے کے بعد پریشان ہونا چھوڑ دیتے ہیں۔

اس سیکشن کے باقی افراد میں ایک خوشگوار تناسب اور توازن قائم تھا یعنی تین کنواری نوجوان لڑکیاں اور تین کنوارے نوجوان لڑکے اس قسم کا توازن حسن وعشق کے معاملے میں مددگار بھی ہوتا ہے اور تصادم کا خطرہ بھی اپنے دامن میں لیے ہوتا ہے۔ یہ تین لڑکیاں تھیں رشمی، نیہا اور کاجل اور لڑکے تھے الوک، لیش پال اور سلیمان۔ رشمی رنگ روپ اور جسمانی طور پر بلاشبہ سب سے دلکش لڑکی تھی مگر وہ اتنی بے باک اور منہ پھٹ تھی کہ لڑکوں کو اُس سے بات کرتے ہوئے ڈر بھی لگتا تھا۔ اُسے ایک ایسی بلی سے تعبیر کیا جاسکتا تھا جو خود اچک کر گود میں آبیٹھتی ہے لیکن گود کے مالک کے ذرا سا ہاتھ پھیرتے ہی اس کا منہ نوچ کر اتر جاتی ہے۔ ان سب باتوں کے باوجود رشمی ہر آدمی کو بری طرح کھینچتی تھی اور وہ دل ہی دل میں اس کو پانے کی آرزو کرنے لگتا۔ نیہا کھلتے ہوئے رنگ اور دلکش چہرے کی ایک پتلی دبلی لڑکی تھی۔ وہ کم بولتی تھی مگر اس کی مسکراہٹ بڑی جان لیوا تھی۔ وہ عام طور پر اسکرٹ اور بلاؤز پہنتی تھی اور عورت کا ہر عضو جو ڈھکا ہوا نہیں ہوتا مرد کے لیے بڑی کشش رکھتا ہے چاہے وہ اس کی ٹانگیں ہی ہوں اور نیہا کی ٹانگیں تو تھیں بھی سڈول اور خوشنما۔

کاجل ایک بنگالی لڑکی تھی مگر اس کے گھر والوں کو کلکتہ چھوڑے ہوئے نصف صدی سے زیادہ ہوگیا تھا۔ کاجل بمبئی میں ہی پیدا ہوئی تھی۔ وہ بنگلہ کم جانتی تھی مگر مراٹھی، اردو اور ہندی روانی سے بولتی تھی۔ لوگ اُسے دیکھتے ہی جان جاتے کہ بنگالی ہے۔ ڈھلتی شام کی طرح سنولایا ہوا رنگ، جو مرد کے لیے گورے رنگ سے زیادہ مہلک ہوتا ہے۔ متناسب ناک اور ہونٹ، سفید ہموار دانت او ربہت بڑی چوکڑی سی بھرتی ہوئی سیاہ آنکھیں۔ وہ ایک سادہ سی ساڑی میں ڈھکی ڈھکائی آتی اور دن بھر کام میں لگی رہتی۔ جب تک وہ بالکل پاس آکر کھڑی نہ ہوجاتی اور مسکرا کر نہ دیکھنے لگتی، وہ کسی کے دل میں کوئی ہیجان پیدا نہ کرتی۔ مگر وہ سب سے سمجھدار لڑکی تھی۔

الوک اس سیکشن میں شاید سب سے خوشحال اور فیشن ایبل لڑکا تھا۔ وہ کام کرتا ہوا بھی کوئی نہ کوئی انگریزی دھن گنگناتا رہتا اور میز کے اوپر اس کا سر اور کندھے اور نیچے اس کے پاؤں اس دھن پر تھرکتے رہتے۔ کھلے دل کا بھی تھا اور دفتر کا کوئی بھی آدمی اس کے

ساتھ کینٹین چلا جاتا تو بل ہمیشہ وہی ادا کرتا تھا۔ وہ کھار میں رہتا تھا اور اُسے فلمیں دیکھنے کا بھی بڑا شوق تھا۔ وہ جاذبِ نظر خدوخال اور لمبے قد کا لڑکا تھا اور اُسے ہر لڑکی کھینچتی تھی۔ دفتر میں وہ رشمی کی طرف مائل تھا۔ لیش پال پنجاب کا رہنے والا تھا اور اس کے والد کی دادر میں ڈبل روٹی، بسکٹ اور مکھن وغیرہ کی چھوٹی سی دکان تھی۔ لیش پال کو چھوٹی دکانداری بالکل پسند نہیں تھی۔ اور کسی ڈھنگ کے بزنس کے لیے نہ اس کے پاس پیسہ تھا اور نہ تجربہ۔ اس نے بی۔ کام کرنے کے بعد اس دفتر میں ملازمت کر لی تھی۔ اور اس سے مطمئن تھا۔ اس کے والدین اس کی شادی کرنے کی بھی سوچ رہے تھے مگر چونکہ وہ ابھی کنوارہ اور نوجوان تھا وہ کبھی رشمی کی طرف اور کبھی نیہا کی طرف بڑھنے کی کوشش میں مصروف تھا۔ سلیمان سب سے حسین، سب سے خاموش اور شاید سب سے سنجیدہ لڑکا تھا۔ ملازمت کے اعتبار سے بھی وہ سب سے نیا تھا۔ اگر شرم وجھجک کے زاویے سے اس کا موازنہ کیا جائے تو وہ مردوں کے بجائے عورتوں کے ساتھ رکھا جائے گا۔ وہ باندرہ میں رہتا تھا اور اس کے والدین کو خوشحال نہیں کہا جا سکتا تھا۔ وہ ایک چھوٹے سے مکان میں رہتے تھے اور گھر میں اس کے والدین کے علاوہ اس کے دادا اور دو اسکول جانے والی چھوٹی بہنیں بھی تھیں۔

رشمی عام طور پر تیزی سے اور قدرے اونچے لہجے میں بولتی تھی جیسے لڑ رہی ہو۔ وہ شاید کسی بھی معاملے کو طول دینے کے حق میں نہیں تھی یا پھر اس کی صاف گوئی اور بے باکی اس کے ناز وادا کا ہی حصہ ہو۔ لیکن یہ حقیقت تھی کہ وہ کسی بھی اپنی طرف بڑھتے ہوئے آدمی کو اپنی صاف گوئی سے عرش سے زمین پر دھم سے گرا دیتی تھی اور اُسے اس بات کی قطعی پروا نہیں ہوتی تھی کہ اس کی بات کو دوسرے بھی سن رہے ہیں۔ جہاں تک آدمیوں کا تعلق تھا وہ تو یہی چاہتے تھے کہ رشمی کسی لالچی اور بھٹکی ہوئی مچھلی کی طرح ان کے کانٹے یا جال میں پھنس جائے لیکن رشمی کو پھسلانا آسان کام نہیں تھا۔ ایک روز اس نے دفتر میں ہی سب کے سامنے الوک سے کہہ دیا۔

''الوک میں چپ چاپ آنسو بہاتے رہنے والے عشق میں یقین نہیں رکھتی۔ نہ میں شادی سے پہلے برسوں ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر پھرنے میں وشواس کرتی ہوں۔ یار جو کرنا ہے بے دھڑک کھل کر کرو اور فوراً کرو۔ بولو مجھ سے شادی کرو گے اور اسی ہفتے؟ محبت وحبت

بعد میں ہوتی رہے گی اور خوب ہوگی۔ ایک بات صاف کہہ دوں، میری محبت تو شادی کے بعد شروع ہوگی۔ بولو کرتے ہو ہاں اور ابھی، سب کے سامنے؟''

اور رشمی ایسا کہتے ہوئے برابر مسکرا رہی تھی اور الوک کی بجائے اوروں کو زیادہ دیکھ رہی تھی۔ راما ناتھن سمیت سب محظوظ ہو رہے تھے اور رشمی کی بات سے اتفاق کرتے معلوم ہو رہے تھے۔ مگر جانے کیوں الوک سہم گیا تھا۔ وہ رشمی کے اس اچانک حملے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اُسے ہمیشہ شادی کے مقابلے میں کھلواڑ نے زیادہ کھینچا تھا۔ وہ سوچتا تھا کہ محبوبہ کے ساتھ شادی ہوگئی تو وہ محبوبہ نہیں رہے گی۔ وہ بھی کوئی نوجوانی ہوئی کہ دو چار لڑکیوں سے کھلواڑ کیے بغیر شادی کے چھوٹے سے بے کیف تالاب میں ڈبکی لگا دو۔ الوک نے اپنے دل میں فیصلہ کرلیا کہ اگر رشمی کی یہی شرط تھی تو اُسے رشمی کی ضرورت نہیں تھی۔

لیش پال نیہا میں دلچسپی لے رہا تھا اور نیہا بھی اُس کی طرف کچھ جھکی ہوئی تھی۔ جب لیش پال اپنی میز پر چائے منگواتا تو آس پاس بیٹھے ہوئے ساتھیوں کے مقابلے میں کونے میں بیٹھی ہوئی نیہا سے پوچھتا کہ چائے پیوگی اور وہ اسی وقت کام چھوڑ کر اور مسکرا کر اس کی میز پر آ کھڑی ہوتی اور دو پیالے بنا کر جب وہ میز کے دوسری طرف پہنچ کر ایک پیالہ لیش پال کے ہاتھ میں دیتی تو پہلے تو لیش پال اس کے حسین چہرے کی طرف دیکھتا مگر پھر فوراً ہی اس کی نظریں اس کی پر کشش ٹانگوں میں الجھ جاتیں۔ اُسے پسند تو رشمی زیادہ تھی مگر رشمی کا اُسے بھروسہ نہیں تھا۔ اس نے دفتر میں سب کے سامنے الوک کی کیسی مٹی پلید کردی تھی۔ ایک روز جب وہ اور نیہا اکٹھے کینٹین میں چائے پی رہے تھے تو نیہا نے ایک عجیب انکشاف کیا۔

''کیا تم جانتے ہو کہ رشمی ایک کیبرے ڈانسر بھی ہے؟''

''کیا کہہ رہی ہو تم؟'' لیش پال نے حیران ہو کر پوچھا۔ ''وہ تو کب سے اس دفتر میں کام کر رہی ہے۔''

''جی ہاں مگر وہ کیبرے ڈانسر بھی ہے اور شام کو سات بجے سے نو بجے تک میٹرو میں ڈانس کرتی ہے۔ تم نے ایک بات نوٹ نہیں کی کہ وہ دفتر ایک بڑا بیگ لے کر آتی ہے۔ اس میں اس کے کیبرے ڈانس کے کپڑے ہوتے ہیں۔ ہوٹل میں اپنا پروگرام

کرنے کے بعد وہ اپنے اُن کپڑوں کو اُتار کر بیگ میں رکھ لیتی ہے اور دفتر والے کپڑے پہن کر گھر لوٹتی ہے۔"

"تمہیں یہ سب کس نے بتایا؟"

"خود رشمی نے۔ وہ دو تین روز ہوئے مجھے میٹرو سے اُترتی ہوئی ملی تھی۔ تم جانتے ہو وہ کسی سے کچھ نہیں چھپاتی۔ اس کے گھر میں سب کو معلوم ہے۔ اس کے ماں باپ نہیں ہیں اور اس کے سر پر اوپر تلے کی چھ چھوٹی بہنوں اور ایک اپاہج بھائی کا بوجھ ہے۔ مجھے تو اس روز سے اس سے بڑی ہمدردی ہو گئی ہے۔"

ہمدردی تو لیش پال کو بھی رشمی سے ہونی چاہیے تھی مگر وہ ان مردوں میں سے تھا جو عورت کو صرف ایک ہی نظر سے دیکھتے ہیں۔ وہ اپنے تصوّر کی آنکھ سے رشمی کو نیم عریاں لباس میں بے ہودہ ڈانس کرتے دیکھنے لگا۔ اس کا تصور اور آگے بڑھ گیا اور وہ نیہا سے بات کرتا ہوا بھی رشمی کے بارے میں سوچنے لگا کہ رشمی کیبرے ڈانسر ہو تو شاید کچھ اور بھی ہو۔ اس نے الوک کی ناکامی کے باوجود اپنی قسمت آزمانی چاہی۔

ایک روز لیش پال کو رشمی باہر اکیلی مل گئی۔ چھٹی کا دن تھا اور لیش پال اپنے لیے کچھ چیزیں خریدنے کے لیے آیا تھا۔ اس نے رشمی کو چائے کی دعوت دی اور وہ فوراً مان گئی۔ وہ رشمی کو پاس کے ہی ایک کافی ہاؤس میں لے گیا۔ اس وقت بھیڑ نہیں تھی دونوں ایک خالی حصے میں میز پر بیٹھ گئے۔ لیش پال نے اپنے لیے کافی اور رشمی کے لیے چائے کا آرڈر دے دیا۔ کافی پیتے ہوئے لیش پال نے اپنی ساری ہمت سمیٹ کر رشمی سے کہا۔

"رشمی تم مجھے بہت اچھی لگتی ہو۔ کیا تم مجھ سے دوستی کر سکتی ہو۔ تم جو کہو گی میں کرنے کو تیار ہوں۔"

"کیسی دوستی؟" رشمی نے اپنی اُسی بے باکی سے پوچھا۔ "اگر تمہارا مطلب شادی کے بغیر عورت مرد والے تعلقات سے ہے تو میرا جواب ایک زوردار نا میں ہے۔ میں تو کسی جذباتی محبت کو بھی نہیں مانتی۔ اس کچی عمر اور وقت کو میں کب کا پار کر چکی ہوں میں تو شاید شادی بھی کبھی نہیں کروں گی ورنہ تم سے ہی کر لیتی۔ میری ذمّے داریاں اتنی ہیں کہ زندگی بھر ختم نہیں ہوں گی۔ میرا خیال چھوڑ دو اور ایک سکون بھری زندگی گزارو۔ میں وہ نہیں

ہوں جو تم سوچ رہے ہو۔''

لیش پال کو یہ جواب پا کر کوئی دکھ نہیں ہوا۔ وہ ایک عام مرد تھا اور اُس نے صرف ایک موقعے کو کریدا تھا۔ اس کے بعد اُس نے نیہا کی طرف توجہ زیادہ کر دی مگر رشمی نے ایک دن نیہا کو بھی لیش پال کی بات بتا دی اور وہ بھی لیش پال سے کٹنے لگی۔ اتنے میں لیش پال کی شادی طے ہو گئی اور اس کے دفتر میں شادی کے کارڈ بانٹنے سے بہت پہلے ہی نیہا لیش پال کو اپنے دل سے نکال چکی تھی۔

سلیمان کو جہاں تک شکل وصورت کا تعلق تھا، تینوں لڑکیاں ہی اچھی لگتی تھیں۔ لیکن اس منزل پر کسی بھی قسم کی دوستی کو وہ محض ذہنی عیاشی سمجھتا تھا۔ نیہا بھی اس کے ذہن کے جذباتی فریم میں نہیں سمائی کیونکہ اُسے ننگی ٹانگوں سے نفرت تھی چاہے وہ عورت کی ہوں یا مرد کی۔ اس کی نظروں میں عورت کی ایک روایتی تصویر تھی یعنی حیا اور وفا کا پیکر اور ایسی لڑکی صرف کاجل تھی۔ وہ بہت دنوں تک کاجل کو چپ چاپ دیکھتا رہا تھا اور دل ہی دل میں اسے پسند کرنے لگا تھا۔ کاجل کو بھی سلیمان اچھا لگتا تھا۔ دونوں ایک دوسرے سے بات کرنے لگے۔ ایک دن کینٹین میں سلیمان کی کاجل سے کافی لمبی بات ہو گئی۔ پھر دونوں ہر روز ہی اکٹھے چائے پینے باہر جانے لگے۔ اس طرح دو مہینے گزر گئے اور وہ جذباتی سطح پر ایک دوسرے کے اور قریب آ گئے۔ مرد کی فطرت ہے کہ وہ پیار کی ہر منزل بڑی بے صبری اور تیزی سے عبور کرنا چاہتا ہے مگر عورت اسے روکے رکھتی ہے لیکن ایک روز جب سلیمان نے چھٹی کے دن کاجل کو ایک سنیما گھر میں پکچر دیکھنے کے لیے بلا لیا اور پکچر کے بعد بھی وہ بڑی دیر تک ایک پارک میں بیٹھے رہے تو کاجل کو محسوس ہوا کہ اُن کے پیار کے راستے میں ایک واضح موڑ آ گیا ہے اور اس نے وہ سوال اٹھا دیا جس کے بارے میں وہ سوچتی رہتی تھی۔ وہ بولی۔

''دیکھو سلیمان تم مجھے بے حد پسند ہو اور میں تمہیں اپنا جیون ساتھی بنانے میں ذرا سا بھی نہیں سوچوں گی، لیکن کچھ سچائیوں کو نہ تم نظر انداز کر سکتے ہو اور نہ میں۔ آج نہیں تو کل ہمیں ان کا سامنا کرنا پڑے گا۔''

سلیمان کچھ سمجھا نہیں۔ اس کی عمر ہی ایسی تھی کہ وہ پیار کی سب منزلوں کو ایک ہی

نظر میں نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اُسے خیال آیا شاید کاجل بھی دوسری لڑکیوں کی مانند شادی کا سوال اٹھائے گی اور یہ بات تو اُس کے تصور میں بھی نہیں تھی۔ وہ کچھ ڈرا ڈرا سا بولا۔

''ہاں بولو تم کیا کہنا چاہتی ہو۔''

''بس یہی کہ میں ایک ہندو بنگالی لڑکی ہوں اور تم مسلمان۔''

سلیمان چونک سا گیا۔ یہ حقیقت یوں اچانک اس کے سامنے آ کھڑی ہوگی، یہ تو اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔ اس نے معصومیت سے پوچھا۔

''اچانک تمہارے ذہن میں یہ سوال کیسے اُٹھ گیا؟''

''میں ایک لڑکی ہوں اور میرے بھی ماں باپ اور رشتے دار ہیں۔ اگر تم مجھے ایک کھلونا نہیں سمجھ رہے ہو تو شادی کا سوال تو اٹھے گا ہی اور اس کے ساتھ مذہب کا بھی۔''

''تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ لیکن میں نے تمہیں کبھی کھلونا نہیں سمجھا۔ یہ میری غلطی ہے کہ میں نے شادی کے بارے میں نہیں سوچا لیکن کیا ایک مسلمان ہندو لڑکی سے شادی نہیں کرسکتا۔ کیا مذہب نے محبتوں کو بھی بانٹ دیا ہے؟''

''ہاں بھی اور نہیں بھی۔ کاجل سنجیدگی سے بولی۔ ''مگر امیروں اور غریبوں کے لیے ہمارے سماج میں الگ الگ قانون ہیں۔ بہت سے دولت منداور مشہور مسلمانوں کی شادی ہندو عورتوں اور ایسے ہی امیر اور مشہور ہندوؤں کی شادی مسلمان عورتوں سے ہوئی ہے۔ سماج میں نہ صرف انہیں عزت ملی بلکہ کسی مرد یا عورت کے مذہب یا نام بدلنے کا سوال بھی نہیں اٹھا۔ یہ سوال غریب طبقے میں اور ہمارے جیسے چھوٹے گھروں میں یقیناً اٹھے گا۔ میں اصولاً اپنے دھرم کو بدلنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔''

کاجل بالکل ٹھیک کہہ رہی تھی سلیمان نے سوچا۔ وہ ایک گہری سوچ میں ڈوب گیا اور پھر کھسیانہ سا ہو کر کاجل کی طرف دیکھنے گا۔

''کیا سوچنے لگے؟'' کاجل نے پوچھا۔ ''کیا ہمارے سامنے کوئی راستہ ہے؟''

''شاید کوئی بھی نہیں۔'' سلیمان اُداس ہو کر بولا۔ ''میں تو ایک قدامت پسند او پابندِ مذہب مسلم گھرانے سے تعلق رکھتا ہوں۔ مالی طور پر ہمیں خوشحال نہیں کہا جاسکتا۔ میرے والدین اور دوسرے گھر والے میرے لیے خود لڑکی منتخب کریں گے اور وہ لڑکی یقیناً

مسلم ہوگی۔ میں پوری ایمانداری سے کہتا ہوں کہ میں نے تمہیں کسی قسم کا دھوکہ نہیں دیا۔ پھر بھی میں تم سے صدق دلی سے معافی مانگتا ہوں۔"

"نہیں اس کی ضرورت نہیں ہے۔" کاجل بولی۔ "ہم دونوں نے کچھ نہیں کھویا ہے مگر میں تم سے اتفاق نہیں کرتی کہ ہمارے سامنے کوئی راستہ نہیں۔ راستہ ہے، مگر ایک ہی راستہ ہے وہ ہے راست روی کا جس پر چل کر کوئی بھی نہیں بھٹکتا، نہ لڑکا اور نہ لڑکی۔"

یہ کہہ کر کاجل تیزی سے اُٹھ گئی اور رومال سے اپنی نم آنکھیں پونچھتی ہوئی بس اسٹاپ کی طرف بڑھنے لگی۔ سلیمان نے بھی اٹھ کر اس کے ساتھ جانا چاہا مگر پھر کچھ سوچ کر وہیں بیٹھا رہا۔ شام کا دھندلکا پھیل رہا تھا۔ اور وہ بہت سی باتیں بیک وقت سوچ رہا تھا۔ جب اندھیرا ہوگیا تو وہ بھی گھر جانے کے لیے کھڑا ہوگیا۔ بس میں بیٹھے ہوئے بھی جو خیال اس کے ذہن میں گردش کر رہا تھا وہ یہ تھا کہ عورتیں مردوں کے مقابلے میں زیادہ سمجھدار اور عملی ہوتی ہیں اور انہیں غلط راستے پر لے جانے اور بہکانے کی ذمے داری صرف مردوں پر عائد ہوتی ہے، اُن مردوں پر جو عورت کو صرف تفریح اور کھلواڑ کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ یہ سوچتے ہی خود اُسے ایک گناہ کا احساس ہوا۔

گھر......ایک دِیا

رتنا ممبئی سے کوئی ساٹھ کلومیٹر ادھر مین لائن پر مالی پور میں رہتی تھی۔ اُس کا گھر اس کے ماں باپ، دو چھوٹے بھائیوں اور ایک چھوٹی بہن پر مشتمل تھا۔ رتنا کے پتا رما کانت پریلکر سرکاری اسکول میں پرائمری کے ٹیچر تھے اور چھوٹے بچے بھی اسکول جانے والے تھے۔ صرف رتنا پچھلے سال بی۔ اے پاس کر کے انگریزی کی ٹائپنگ سیکھ چکی تھی۔ مالی پور تھا تو تقریباً ایک لاکھ کی آبادی کا شہر مگر نہ تو یہاں کوئی قابلِ ذکر انڈسٹری تھی اور نہ کوئی بڑے سرکاری دفتر۔ اس لیے ملازمت کے مواقع، اور خاص طور پر تعلیم یافتہ لڑکیوں کے لیے، بہت کم تھے۔ گھر کی حالت یوں تو ٹھیک تھی کیونکہ اپنا گھر کا مکان تھا مگر خوشحال نہیں تھی۔ اس لیے رتنا نوکری کرنے کی خواہشمند تھی اور اس نے ماں کو سمجھا دیا تھا کہ اس کی شادی کے بارے میں ابھی دو تین سال تک بالکل نہ سوچا جائے کیونکہ وہ پہلے نوکری کر کے اپنے پاؤں پر کھڑی ہونا چاہتی تھی اور جو روپیہ وہ جوڑے گی وہ اس کی شادی میں کام آسکتا تھا۔ رتنا بیس سال کی ہوگئی تھی اور گورے رنگ کی پتلی دبلی اور خوبصورت لڑکی تھی۔

رتنا ہر روز اخبار پڑھتی تھی اور چھپے ہوئے اشتہارات کے جواب میں اپنی درخواستیں بھیجتی رہتی تھی۔ یہ اشتہارات عام طور پر ممبئی کے ہوتے تھے۔ وہاں کھار میں اس کے ماما رہتے تھے اور ممبئی میں نوکری مل جانے کی صورت میں وہ ان کے ساتھ رہ سکتی تھی۔ ایک روز اس کی درخواست کے جواب میں ممبئی کی ایک فرم تارا پور اینڈ کمپنی نے بغیر انٹرویو کے اُسے آفس اسسٹنٹ کے طور پر تقرری کی چٹھی بھیج دی اور اسے پندرہ دن کے اندر

رپورٹ کرنے کے لیے کہا گیا۔ کل ملا کر تنخواہ تین ہزار روپے تھی۔ شرط صرف یہ تھی کہ اس کی ٹائپنگ کی سپیڈ چالیس الفاظ فی منٹ سے کم نہ ہو۔ رتنا کی ٹائپنگ سپیڈ تو پچاس الفاظ فی منٹ تھی اور وہ انگریزی بھی بخوبی بولتی تھی۔ اس چٹھی کو پاکر رتنا تو بہت خوش تھی ہی مگر گھر میں بھی خاصہ جوش وخروش رہا۔ چھ دن کے بعد رتنا اپنی پوری تیاری سے اپنے پتا کے ساتھ اپنے ماما کے پاس ممبئی پہنچ گئی۔ رما کانت تو اگلے ہی دن جو اتوار تھا واپس چلا گیا مگر ماما اور مامی دن بھر اُسے کچھ کچھ سمجھاتے رہے۔ سوموار کو ماما رتنا کو لوکل ٹرین سے اُس کے دفتر چھوڑ آیا اور جب رتنا کو رکھ لیا گیا اور وہ اپنی میز پر بیٹھ گئی تو ماما اسے اچھی طرح سمجھا کر کہ اسے کیسے اور کہاں سے گھر لوٹنا تھا، وہ ادھر سے ہی اپنے کام پر چلا گیا۔ رما کانت جب لوٹنے لگا تھا تو جانے کیوں رتنا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ بڑی حساس تھی۔

رتنا کا یہ دفتر بڑا اچھا تھا اور لڑکیوں کے لیے تو اس کا ماحول کافی خوشگوار تھا۔ دفتر میں پندرہ بیس افراد کام کرتے تھے۔ سب ایک بڑے ہال میں بیٹھتے تھے اور صرف منیجر کا الگ کمرہ تھا۔ عورتیں چھ تھیں جن میں سے دو ادھیڑ عمر کی تھیں۔ نوجوان عورتوں میں پارسی لڑکی گلنار سب سے حسین تھی مگر وہ کسی سے بات نہیں کرتی تھی۔ دو جڑواں گجراتی بہنیں تھیں مگر وہ اپنے میں ہی مست رہتی تھیں۔ رتنا کو سب سے اچھی گوآ کی کرسچن لڑکی سارہ لگی۔ وہ سب سے زیادہ دلکش، ہنسوڑا اور چلبلی تھی۔ وہ تھی تو ہلکے سانولے رنگ کی مگر اس کے چہرے پر غضب کا نکھار اور خدوخال میں غیر معمولی کشش تھی۔ وہ لمبے قد ار متناسب جسم کی بڑی خوشگوار لڑکی تھی۔ اس کے دانت کیا تھے خوبصورتی سے جڑے ہوئے سفید موتیوں کی قطاریں تھیں اور وہ مسکراتی تو بے حد جاذبِ نظر ہو جاتی۔

مردوں میں صرف چار نوجوان تھے۔ ایک سولانکی جو شادی شدہ تھا مگر ہر لڑکی پر نظر رکھتا تھا۔ دوسرا ڈی سوزا جو بڑا شرمیلا تھا اور کسی بھی لڑکی کو دیکھتا تو آنکھیں جھکا لیتا تھا۔ تیسرا سامنت ساٹھے جو خوبرو ہونے کے ساتھ ساتھ بڑا شائستہ اور مہذب بھی تھا۔ چوتھا بینرجی جو ہر پانچ دس منٹ کے بعد پان کا ٹکڑا منہ میں ڈال لیتا تھا۔ باقی کے مرد یا تو کام کرتے رہتے تھے یا اپنے گھر والوں کے بارے میں سوچتے تھے۔ دفتر کا انچارج خالد ایک شریف النفس، بردبار اور حلیم آدمی تھا۔ اس کی عمر ۵۵ سال تھی اور وہ سنجیدگی سے ہر وقت کام میں لگا رہتا تھا۔ وہ دفتر کے وقت میں ملازمین کے بولنے، ہنسنے اور باہر جانے پر ٹوکا ٹا کی

نہیں کرتا تھا۔ اس کی صرف ایک شرط تھی کہ روز کا کام ہر ایک کو پورا کر کے ہی گھر جانا ہوگا۔

رتنا کا ممبئ میں پہلا مہینہ جوش وخروش اور مسرّتوں میں لپٹا ہوا تیزی سے گزر گیا۔ وہ اس لاثانی شہر کی چمک دمک، گہما گہمی، بھیڑوں اور بجلی سے چلنے والی لوکل ٹرینوں سے بہت خوش تھی۔ جب اُسے پہلی تنخواہ ملی تو اُس کا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ اُس نے راستے میں ایک مٹھائی کا ڈبہ خریدا اور گھر پہنچ گئی۔ اس نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ اپنی پہلی تنخواہ اپنے خرچ کے لیے روپے رکھ کر مامی کے حوالے کر دے گی مگر جب اس نے ایسا کیا تو مامی نے یہ کہہ کر روپے نہیں لیے کہ اگر تم دو تین مہینے کے لیے ممبئ میں ہمارے یہاں ٹھہر جاؤ گی تو کیا ہم اس کے لیے پیسے لیں گے۔ رتنا کے دل کو دھکا لگا کیونکہ مامی کی اس بات میں یہ اشارہ بھی صاف تھا کہ اُس کے یہاں ٹھہرنے کا انتظام عارضی تھا۔ اس نے رات کو سوتے ہوئے اِس بات پر سوچا تو اس نتیجے پر پہنچی کہ اس کی مامی بھی شاید غلط نہیں تھی۔ اُس کے ماما کوہِ نور ملز میں ایک کاریگر ہی تو تھے۔ پھر اُن کے تین بچے تھے اور اس دو نہایت چھوٹے کمروں کے مکان میں جس میں الگ رسوئی بھی نہیں تھی رہنے کی بھی دقت تھی۔ وہ خود نیرا کے ساتھ سوتی تھی جو اسکول جانے والی چودہ سال کی لڑکی تھی۔ پھر اپنی ملازمت کی وجہ سے وہ اپنی مامی کی گھر کے کام کاج اور کھانا بنانے میں بھی کوئی خاص مدد نہیں کرسکتی تھی۔ لیکن آخر وہ ممبئ جیسے شہر میں اپنی رہائش کا کوئی دوسرا انتظام بھی کیا کرسکتی تھی۔ بہر حال چونکہ اس کے ماما نے اسے کچھ نہیں کہا تھا اور وہ ہر لحاظ سے اُس کا پورا دھیان رکھتا تھا، اُس نے زیادہ سوچنا مناسب نہیں سمجھا۔ ہاں چونکہ مامی نے پیسے نہیں لیے تھے، رتنا نے اگلے دن سے دفتر سے لوٹتے ہوئے گھر کے لیے سبزی وغیرہ اور دوسری استعمال کی چیزیں لانا شروع کر دیں۔ دو تین مہینے اور گزر گئے۔

رتنا میں ممبئ آکر دو تبدیلیاں آ گئی تھیں۔ ایک تو یہ کہ اُس نے اس شہر کی چکا چوند اور شوریدہ زندگی کو نظروں میں سما لیا تھا اور بارونق بازاروں اور سڑکوں پر سے گزرتے ہوئے ایک موج در موج، ہیجان انگیز زندگی کی وہ جھلک دیکھ لی تھی جسے بے انتہا دولت کے پہیے دھکیلتے تھے۔ وہ نوجوان تھی اور اس میں قدرتی طور پر کچھ انجانی سی خواہشیں سر ابھارنے لگی تھیں۔ دوسری تبدیلی یہ تھی کہ وہ اپنی صفائی، لباس اور چہرے کی طرف خاص توجہ دینے لگی تھی۔ مالی پور میں تو شاید اس نے اپنی ماں کے پاؤڈر کے سوا کوئی بھی میک اپ کی چیز

استعمال نہیں کی تھی۔ مگر اب وہ ایک زیادہ کھلی اور وسیع فضا میں قدم زن تھی اور دفتر جانے والی لڑکی تھی۔ اس نے ایک شام سارہ کے ساتھ جا کر میک اپ کی کچھ چیزیں خرید لیں اور اُن میں سے دو تین تو ایسی تھیں جن کا اُسے تصور بھی نہیں تھا! وہ خوبصورت تو تھی ہی مگر اِن کے استعمال سے اس کے چہرے پر غضب کا نکھار آ گیا اور دفتر والوں کی نظریں بھی اب سارہ کے مقابلے میں اُس پر زیادہ پڑنے لگیں۔ رتنا نے محسوس کیا کہ اس میں ایک خود اعتمادی کا احساس بھی جاگ گیا تھا۔ وہ اب مردوں سے بات کرنے میں کوئی جھجک محسوس نہ کرتی اور سولانکی اور سامنت سے تو کھل کر بات کر لیتی تھی۔ مگر پھر بھی وہ مای پور کی رتنا تھی اور اپنے قدموں کو مضبوطی سے اپنی زمین پر ٹکائے رکھتی۔

ایک روز رتنا کی مامی نے جب اُسے غصے سے یہ کہہ دیا کہ اُسے تو اپنے بناؤ سنگھار سے ہی فرصت نہیں ملتی تھی اور وہ اپنے کمرے تک کی صفائی بھی نہیں کرتی تھی اور جو چیز جہاں چاہے پٹک دیتی تھی تو اسے برا بھی لگا اور وہ مغموم بھی ہو گئی۔ یہ سچ نہیں تھا کیونکہ دفتر سے لوٹنے کے بعد اور چھٹی والے دن تو وہ بہت کام کرتی تھی۔ اسے ایسا لگا کہ مامی اب اُسے مزید رکھنا نہیں چاہتی تھی۔ اس روز اس کا دفتر میں بھی جی نہیں لگا۔ لنچ کے گھنٹے میں جب ہال خالی سا ہو گیا اور سارہ نے اس سے پوچھ لیا کہ وہ آج اتنی چپ چاپ کیوں تھی تو رتنا نے اسے سب کچھ بتا دیا۔ سارہ بولی۔

''دیکھ رتنا زیادہ دیر تک رشتے داروں کے یہاں ٹھہرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ میں جب یہاں آئی تھی تو ایک رشتے دار کے ہاں اسی طرح ٹھہر گئی تھی۔ مگر مجھے تو کئی قسم کی مشکلوں کا سامنا کرنا پڑا۔ نوجوان لڑکی کو تو ہر ایک تر نوالہ سمجھتا ہے۔ میں تو فوراً منی پٹیل کے لڑکیوں کے ہوسٹل میں چلی آئی اور وہاں بڑی خوش ہوں۔ ایک کمرے میں دو لڑکیاں اور بیڈ ٹی۔ بریک فاسٹ اور ڈنر کے ساتھ صرف ڈیڑھ ہزار روپے ماہوار۔ ممبئی میں اس سے سستا کوئی انتظام نہیں ہو سکتا۔ وارڈن روڈ پر ہے، یہاں سے صرف پانچواں اسٹیشن۔ تو کل وہیں چلی آ۔ ابھی تو جگہ مل جائے گی۔ دو لڑکیاں شادی کے بعد کل ہی ہوسٹل چھوڑ کر گئی ہیں۔''

''لیکن کیا یہ ہوسٹل ہم لڑکیوں کے لیے محفوظ ہے۔ یہ شہر تو اس معاملے میں بڑا بدنام ہے۔''

''یہ ہوسٹل بالکل محفوظ ہے۔ اس میں چوکیدار کے سوا کوئی مرد ملازم نہیں ہے۔

کچن میں بھی دو عورتیں ہی کام کرتی ہیں اور ہم سب کو بیڈ ٹی تک خود وہاں جا کر لینی پڑتی ہے۔ صرف دس کمروں کا دو منزلہ گھر ہی تو ہے۔ جس میں ہماری جیسی بیسیوں کم تنخواہ والی عورتیں رہتی ہیں۔ رمنی پٹیل بڑی عمر کی بے اولاد بیوہ اور سوشل ورکر ہے اور یہ مکان اُس کا اپنا ہے۔ میں آج بات کرلوں گی۔ کل کی چھٹی ہے تو اپنے سامان کے ساتھ آ جا۔ کتنا سامان ہے تیرا؟''

''صرف ایک اٹیچی۔''

''ٹھیک ہے۔ تو کل آ جا۔ میرے کمرے میں ایک بڑی عمر کی گجراتن ہے۔ اُس کو دوسرے کمرے میں کروا دیں گے۔ ہم دونوں اکٹھے رہیں گے۔''

رتنا رمنی پٹیل کے ہوسٹل میں چلی آئی۔ اُس کے ماما نے اُسے روکنے کی کوشش کی تھی مگر مامی کے کچھ اشارہ کرنے پر وہ بھی چپ ہو گیا۔ لیکن وہ رتنا کے ساتھ ہوسٹل تک آیا اور رمنی پٹیل سے بھی ملا۔ شام کو رتنا نے اپنے گھر چٹھی لکھ کر انہیں اپنا نیا پتہ مطلع کر دیا اور یہ اطمینان دلا دیا کہ وہ ماما کے گھر سے اس لڑکیوں کے ہوسٹل میں صرف اس لیے چلی آئی تھی کیونکہ یہ جگہ دفتر کے پاس تھی اور ماما کے گھر سے دفتر پہنچنے میں ہر روز دیر ہو جاتی تھی اور یہ کہ وہ ہر چھٹی کا دن ماما کے گھر پر ہی گزارے گی۔ کچھ اسی قسم کی چٹھی ماما نے بھی وہاں لکھ دی تھی۔ سارہ کی کوشش سے رتنا کو اس کے کمرے میں ہی رکھ لیا گیا تھا۔

رمنی پٹیل بھی ہوسٹل میں ہی رہتی تھی اور سارا انتظام خود کرتی تھی۔ وہ پچاس پچپن سال کی، نہایت خوشگوار، شائستہ اور بے حد چست خاتون تھی۔ اس وقت ہوسٹل میں رتنا سمیت انیس عورتیں تھیں اور صرف پانچ چالیس سال سے اوپر کی تھیں۔ انہوں نے یا تو شادی نہیں کی تھی یا ان کے آدمیوں نے انہیں چھوڑ دیا تھا۔ ان کا ایک ہی اپنا گروپ تھا۔ باقی کی چودہ لڑکیاں بالکل نوجوان تھیں، یعنی ۱۸ سال سے ۲۵ سال تک کی اور سب کی سب کنواری تھیں۔ یہ لڑکیاں مہاراشٹر، گجرات اور گوآ کی تھیں۔ سارہ تو خوشگوار ہلکے سانولے رنگ کی تھی مگر دوسری تینوں گوآ کی لڑکیاں کالی تھیں۔ وہ اونچا سکرٹ اور بلاؤز پہنتی تھیں اور ان کے جسموں میں کافی کشش تھی۔ مہاراشٹر کی لڑکیاں نوعمر، گورے رنگ کی، اوسط جسم اور قد کی تھیں۔ گجراتی لڑکیاں سب سے حسین، گورے رنگ اور نازک بدنوں کی تھیں مگر بالکل گھریلو قسم کی تھیں اور اپنے گجراتی لباس اور پھولوں اور گجروں کی

آرائش اور سج دھج پر سختی سے قائم تھیں۔ گو آ کی وہ تینوں لڑکیاں اور چند دوسری لڑکیاں بھی ڈنر کی پرواہ کیے بغیر فرداً فرداً باہر نکل جاتی تھیں اور اپنی شامیں باہر گزار کر ساڑھے گیارہ بجے تک واپس آنے کی کوشش کرتی تھیں کیونکہ اس کے بعد ہوسٹل کا گیٹ بند کر دیا جاتا تھا اور کسی بھی صورت میں نہیں کھولا جاتا تھا۔

رتنا کو ممبئی آئے ہوئے ایک سال سے زیادہ ہو گیا۔ اُسے اپنا دفتر، ممبئی شہر اور اس ہوسٹل میں سارہ کے ساتھ بیتا ہوا وقت، سب کچھ بہت پسند تھا۔ اس اثنا میں وہ دس دن کی چھٹی لے کر مالی پور بھی ہو آئی تھی۔ وہاں سب نے کہا تھا کہ اُس کا رنگ روپ کتنا نکھر گیا تھا اور وہ بہت اچھی لگتی تھی۔

ایک روز ممبئی میں زبردست بارش ہوئی۔ بیشتر سڑکیں پانی میں ڈوب گئیں اور کچھ علاقوں میں تو اتنا پانی بھر گیا کہ گھروں سے باہر نکلنا اور ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا ناممکن سا نظر آیا۔ کوئی بس نہیں چل رہی تھی اور ہر سڑک پر بگڑی ہوئی گاڑیاں پانی میں آدھی ڈوبی ٹیڑھی میڑھی کھڑی تھیں۔ یہ بارش پوری تندی سے رات بھر ہوتی رہی تھی اور ابھی تک نہیں تھمی تھی۔ لوکل ٹرینوں کی پٹڑیاں بھی پانی میں چھپی پڑی تھیں اور اسٹیشنوں پر بھی پانی آ گیا تھا۔ بہت سی لوکل ٹرینیں منسوخ ہو گئی تھیں۔ ایسے موسم میں رتنا اور سارہ کی آنکھ بھی دیر میں کھلی مگر جب وہ جلدی جلدی تیار ہو کر پہنچے اتریں تو انہیں پتہ لگا کہ آج تو کوئی بھی اپنے کام پر نہیں جا سکی تھی اور سب نیچے اپنی اپنی چھتری بغل میں دبائے چھت دار برآمدے میں کھڑی تھیں۔ باہر کی سڑک تو ایک جھیل بنی ہوئی تھی جس میں ہر عمر کے بچے ننگے یا ادھ ننگے ادھر ادھر بھاگ رہے تھے۔ رتنا اور سارہ بھی کھڑی ہو کر یہ منظر دیکھتی ہیں۔ ایسے حالات میں دفتر پہنچنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ رتنا اور سارہ کچھ دیر ٹھہر کر اوپر اپنے کمرے میں چلی آئیں اور اپنے ہینڈ بیگ اور چھتریاں ایک بیڈ پر پٹک کر دوسرے پر دونوں لیٹ گئیں۔

باہر سرمئی رنگ کے دبیز بادلوں نے اپنی پوری بانہیں پھیلا کر بے بس آسمان کو پوری طرح جکڑ رکھا تھا اور آفتاب جانے کس کونے میں منہ ڈھانپے بیٹھا تھا۔ باہر ملگجی اندھیرا تھا مگر کمرے میں یہ اندھیرا کھڑکی کھلی ہونے کے باوجود زیادہ گہرا تھا۔ بتی جلا کر سارہ اور رتنا نے اس رومان پرور فضا کو کم نہیں کیا۔ سارہ بولی۔

''رتنا میں آج تجھے اپنے بارے میں بتاتی ہوں۔ میں گوآ میں پاناجی کی رہنے والی ہوں۔ میرے فادر نے میری ممی کو جب وہ صرف تیس سال کی تھی اور تین بچیوں کی ماں بن چکی تھی چھوڑ دیا تھا اور ایک چالیس سال کی مالدار بیوہ سے شادی کر کے دمن میں بس گیا تھا۔ میری ماں بے سہارا ہوگئی۔ ہم تینوں لڑکیاں، اور میں سب سے چھوٹی تھی، کرسچن ہائی اسکول میں پڑھتی تھیں۔ میری بڑی بہنیں تو ساتویں آٹھویں کلاس بھی پاس نہیں کر سکیں اور اسکول چھوڑ کر گھر بیٹھ گئیں۔ میں نے کسی نہ کسی طرح ہائی اسکول پاس کر کے ٹائپنگ سیکھ لی اور کمپیوٹر کی ٹریننگ بھی لے لی۔ رتنا ہمارا گوآ کا عیسائی سماج بڑا خراب ہے۔ عورتیں بھی کھلے عام رقص کرتی اور دارو پیتی ہیں۔ میری ماں جوان اور بے یار و مددگار تھی اور غیر مردوں کا ہمارے یہاں آنا جانا شروع ہو گیا۔ میری ماں بھی بھٹک گئی اور میری دونوں بہنیں بھی۔ وہ مجھ سے بھی زیادہ خوبصورت تھیں اور بڑی بیباک اور آگے بڑھنے والی تھیں۔ نوجوان لڑکے آتے اور انہیں گھر سے باہر لے جاتے۔ ممی نے انہیں کبھی نہیں روکا۔ پیسے کی تنگی بے سہارا عورت کو مجبور کر دیتی ہے رتنا۔ جب میں نے نوجوانی کی دہلیز میں قدم رکھا تو گھر میں آنے والے مردوں اور لڑکوں نے مجھے بھی للچائی نظروں سے دیکھنا شروع کر دیا۔ میں کچھ اور مٹی کی بنی تھی اور میں اٹھ کر اندر کمرے میں چلی جاتی اور ممی کے آواز دینے پر بھی نہ آتی۔ شکر ہے گاڈ کا اور یسوع مسیح کا کہ میں اپنے آپ کو اس ماحول سے بچا سکی اور اس نوکری کے ملتے ہی ممبئی چلی آئی۔ رتنا سن رہی ہے تو یا سوگئی؟''

''سن رہی ہوں سارہ'' رتنا بھی اُس کی طرف کروٹ لے کر بولی ''اور سچ تو یہ ہے کہ میں مغموم بھی ہوگئی ہوں۔ میں تو سیدھی سادی ایک قصبے کی لڑکی ہوں اور اگر آنکھوں نے کچھ برا دیکھا ہے تو یہاں ممبئی آ کر۔ پھر بھی میں یہ سوچ رہی تھی کہ اس اندھیری ظالم دنیا میں اگر کوئی چاندنا ہے تو وہ گھر بار کا ہے۔ اُس کے اندر مہربان اور شفیق ماں باپ کا ہے، بہن بھائی کے پیار کا ہے۔ شادی کے بعد بھی یہ پتی اور پتنی کے اٹوٹ پیار کا ہے۔ بچوں کی ہمک اور دلار کا ہے۔ مگر تیری کہانی سن کر تو میں ڈر گئی ہوں اور ایسا لگتا ہے کہ اس خراب دنیا کے اندھیرے میں، گھر بھی ایک دیا، ایک روشنی نہیں ہے۔ کیا تیرا اپنی ماں اور بہنوں سے اب کوئی تعلق ہے؟''

''نہیں، کوئی خاص نہیں۔ بس کبھی کبھی خط لکھ دیتی ہوں یا ماں کو کچھ روپے بھیج

دیتی ہوں۔ آخر ماں ہے۔ بڑی بہن کسی کے ساتھ بھاگ گئی ہے اور اس کا کچھ پتہ نہیں۔ دوسری بہن ماں کے ساتھ ہی ہے۔ ماں بلاتی ہے مگر میں نہیں جاتی کیوں کہ وہ ماحول نہیں بدلا ہوگا۔ ہاں جو تو نے ابھی گھر کی بات کہی تو پگلی اگر کہیں سچی محبت اور پیار رہتا ہے تو وہ گھر ہی ہے، اُس کی چار دیواری، اُس کا آنگن اور اس کی دہلیز۔ اور اُس مسرت اور پیار کا محور ہے، عورت اور صرف عورت۔''

''کیا تو شادی سے پہلے محبت میں یقین رکھتی ہے؟'' رتنا نے پوچھا

''یہ کسی کے بس کی بات نہیں۔ انسان کی زندگی محبت کے بغیر ادھوری ہے۔ محبت شادی سے پہلے بھی ہوسکتی ہے اور بعد میں بھی۔ شادی سے پہلے ہونا تو موقع اور حالات پر منحصر ہے مگر شادی کے بعد بھی مرد اور عورت کے درمیانی یہ جذبہ قدرتی بھی ہے اور طاقتور بھی۔ خوش قسمت ہیں وہ لڑکیاں جن کی محبت کا انجام شادی ہوتا ہے۔ رتنا میں بھی ایک ایسی ہی خوش قسمت لڑکی ہوں۔''

''کیا'' رتنا چونک کر بیٹھ گئی ''میں سمجھی نہیں۔ کیا تیری شادی ہوچکی ہے؟''

سارہ بھی اُٹھ کر بیٹھ گئی اور اپنی ٹھوڑی کے نیچے ہاتھ رکھ کر بولی۔

''نہیں۔ مگر اس ماہ کے آخر میں میری شادی ڈی سوزا سے ہو رہی ہے۔ اور سن تجھے میری شادی میں میری بیسٹ فرینڈ بننا ہوگا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو ٹوٹ کر چاہتے ہیں۔ اُس نے مجھے اپنے ماں باپ سے بھی ملوا دیا ہے اور انہوں نے مجھے قبول کرلیا ہے۔ ڈی سوزا بڑا مذہبی آدمی ہے اور ہر اتوار کو چرچ جاتا ہے۔ مذہب اور اخلاق کا چولی دامن کا ساتھ ہوتا ہے۔''

باہر بادل کان پھاڑنے والی آواز میں گرجے۔ سارہ نے اٹھ کر کھڑکی بند کردی اور بتی جلا دی۔ دونوں پھر پلنگ پر ساتھ ساتھ لیٹ گئیں۔ رتنا نے اپنا ہاتھ سارہ کے سینے پر رکھ دیا اور بولی۔

''جب تو نے اپنی بات بتا دی ہے تو میری بھی سن لے۔ مجھے تو پیار محبت کا تصور بھی نہیں تھا۔ کسی غیر مرد یا نوجوان سے بات کرنے کا بھی موقعہ نہیں ملا۔ میں تو یہی جانتی تھی کہ ایک دن میرے ماں باپ میرے لیے کوئی لڑکا دیکھ کر میری شادی کر دیں گے اور میرا وہ سپنوں کا راجکمار مجھے اپنے گھر لے جائے گا۔ ممبئی آکر مردوں کے درمیان

بیٹھنے اور بات کرنے کا موقعہ ملا۔ تو سچ کہتی ہے یہ موقعہ ہی شادی سے پہلے کی محبت کی جڑ ہے۔ میں دفتر میں سولانکی سے بات کرتی تو بڑا اچھا لگتا۔ اُس کی آنکھوں میں بڑی کشش تھی اور ایک روز میں دفتر کے بعد اُس کے کہنے پر اس کے ساتھ ایک رسٹوران میں چائے پینے چلی گئی۔ وہاں اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ مجھے غصہ آ گیا اور میں باہر نکل گئی۔ اس کے بعد میں اس سے نہیں بولی۔"

"تو بچ گئی رتنا" سارہ بولی "وہ ایک شادی شدہ اور بد اخلاق آدمی ہے۔ اُس نے مجھ پر بھی ڈورے ڈالنے کی کوشش کی تھی۔"

"لیکن میری کہانی یہ نہیں ہے۔" رتنا مسکرا کر بولی "میں سامنت سے پیار کرنے لگی۔ وہی کمبخت موقع کی بات ہے۔ لگا سامنت ہی میرے سپنوں کا شہزادہ ہے۔ پہلی دفعہ پیار کی بے پناہ کشش اور طاقت کو محسوس کیا اور میں اِس سیلاب میں تنکے کی طرح بہہ گئی۔ ہم دونوں ہی ایک دوسرے کو بے حد چاہتے ہیں اور باہر ملتے بھی ہیں۔ مگر ہمارا پیار سچا اور پاکیزہ ہے۔ سامنت نے مجھے کبھی ہاتھ تک نہیں لگایا۔"

اتنا یہ کہہ کر چپ ہوگئی۔ سارہ بولی۔

"رتنا سامنت بہت ہی اچھا لڑکا ہے اور مہاراشٹر کا ہی ہے، یعنی تیرے ہی پرانت کا۔ شادی کے بارے میں تم نے کیا سوچا۔ سامنت ــــ کو چاہیے کہ اپنے گھر والوں سے بات کرے۔ بڑا مزہ آئے گا۔ ایک ہی دفتر میں دو شادیاں۔ تو بھی کچھ سوچ اور جلدی کر لے۔"

"ہم دونوں نے سوچا اور اُس پر عمل بھی کر لیا۔ میں تو ماں باپ کی مرضی کے بغیر شادی کرنے کی سوچ بھی نہیں سکتی۔ سامنت نے اپنے ماں باپ سے بات کر کے اُن سے میرے گھر چٹھی لکھوا دی تھی۔ انہوں نے ہاں کر دی ہے۔ ماما کے پاس بھی پتا جی کی چٹھی آئی تھی اور ماما ان کی طرف سے سامنت کے ماتا پتا سے مل بھی آئے ہیں۔ سب کچھ ہو گیا ہے اور شادی بھی گیارہ نومبر یعنی دو ماہ بعد کی طے پائی ہے۔ سارہ تجھے اور ڈی سوزا کو میری شادی میں مالی پور آنا ہوگا۔"

سارہ اٹھ کر بیٹھ گئی اور اُس کے ساتھ رتنا بھی۔ دونوں ایک دوسرے کو مسکرا کر دیکھنے لگیں۔ دونوں کے خوابوں کی تکمیل ہونے والی تھی۔ دو اور گھر آباد ہونے والے تھے۔ دو نئے دیئے روشن ہوں گے۔ سارہ رتنا کو پیار بھری نظروں سے دیکھ کر بولی۔

''ہم دونوں یقیناً'' تیری شادی میں آئیں گے۔ میں سوچ رہی ہوں ہم دونوں کے خیالات کتنے ملتے ہیں۔ ہم دو اجنبی لڑکیاں ایک سال میں ہی ایک دوسرے کے کتنے قریب آ گئی ہیں۔ شاید ہم کسی جنم میں بہنیں ہوں۔ رتنا ایک بات یاد رکھنا کہ گھر کا دیا جلتا تو مرد اور عورت دونوں سے ہے مگر اسے روشن رکھنے میں عورت کی وفا، قربانی اور پیار سب سے زیادہ کام آتے ہیں۔ اچھا باتیں تو بہت ہو گئی ہیں۔ چل کچن میں چل کر چائے بنواتے ہیں۔''

''ہاں چل۔ مگر پہلے دیکھ لیتے ہیں کہ موسم کا کیا حال ہے۔'' رتنا بولی۔

دونوں اٹھ کر کھڑکی کے پاس پہنچیں اور سارہ نے اُس کے دونوں پٹ کھول دیئے۔ ہوا کا ایک بھیگا سا جھونکا دونوں کے چہروں سے ٹکرا گیا۔ بارش اب رُک گئی تھی اور سڑک پر سے پانی اتنا ہٹ گیا تھا کہ کچھ گاڑیاں بھی چلنے لگی تھیں۔ مگر اتنا قابلِ اعتبار موسم ابھی نہیں ہوا تھا کہ بے خطر باہر نکلا جا سکے۔ ضدّی بادل ابھی تک آسمان سے چمٹے ہوئے تھے۔ صرف مشرقی سمت اجالے کا ایک چھوٹا سا دامن پھوٹ آیا تھا اور وہاں دو پرندے مائل پرواز دکھائی دے رہے تھے۔ سارہ نے رتنا کی بانہہ پکڑی اور بولی۔

''چل چائے پیتے ہیں۔ کچن میں تو اب شاید کوئی نہ ہو اور ہمیں خود بنانی پڑے۔''

نیا زمانہ، نئے رنگ!

وقت نے اتنی تیزی سے پلٹا کھایا تھا کہ کل تک کے سوئے ہوئے سے افلاس اور بے کاری کے مارے عام شہر بھی یکا یک ترقی پذیر اور دولتمند لگنے لگے تھے۔ بلاشبہ ہر سو آبادی بھی بے تحاشہ بڑھ گئی تھی اور اس سے سڑکوں اور بازاروں میں لوگوں کی ریل پیل اور آمد و رفت میں بہت اضافہ ہوگیا تھا۔ فرخ نگر بھی ایک ایسا ہی شہر تھا جس کی سب سے بڑی سڑک پر جو شاہراہ کا ایک حصّہ تھی اور جس کے دونوں طرف دکانیں بن گئی تھیں۔ ایک پٹرول پمپ کھل گیا تھا اور گاڑیوں اور لوگوں کا گزرنا مشکل ہوگیا تھا۔ سست رفتار بیل گاڑیوں، تانگوں اور کشاؤں کے علاوہ جدید سے جدید موٹر کاروں، بسوں اور لاریوں کی بھرمار سے یہ سڑک سارا دن بُری طرح اَٹی پڑی رہتی تھی اور صرف رات کو دس بجے کے بعد ہی آرام کا سانس لے سکتی تھی۔ فرخ نگر کی نمایاں ترقی کے خد و خال میں شہر کے بیرونی قصبے میں ایک نئی کالونی نہرو نگر کا قیام تھا جس میں جدید طرز کی کوٹھیاں اور ایک شاندار مارکیٹ تھی، دو تین فیکٹریوں کا شروع ہونا اور پرانے شہر میں بھی روز افزوں بیوپار اور مکانوں کی توسیع اور تعمیر کا ذکر کیا جاسکتا تھا۔ ایک صاف نظر آنے والی خوشحالی کی چادر فرخ نگر کے چاروں طرف پھیل رہی تھی۔

پہلے فرخ نگر میں صرف تین چار پرانی گاڑیاں ہی تھیں اور وہ بھی گھروں کے باہر یا آنگن میں خستہ حالت میں کھڑی رہتی تھیں۔ یا کچھ عرصے پہلے ایک دو ماروتی کاروں کا اضافہ ہوگیا تھا۔ مگر اب تو کسی بھی نئی کار کا جونہی دلّی کے انگریزی کے اخباروں میں یا ٹی۔ وی

پر اشتہار آیا اور وہ کتنی بھی قیمتی ہو فرخ نگر کی جدید کالونی نہرو نگر میں وہ ضرور خریدی جائے گی۔ نئی کاریں ہی کیا جدید آرام اور آسائش اور فیشن کا کوئی بھی سامان ایسا نہ تھا جو ان کوٹھیوں میں نظر نہ آتا ہو۔ نئے نئے اور بڑے سائز کے کلر ٹی۔وی، قیمتی میوزک سسٹم، کمپیوٹر معہ ٹیلیفون اور انٹرنیٹ وغیرہ ان کوٹھیوں کی امارت کے نشان بن گئے تھے۔ مگر اس کالونی کی سب سے قابلِ دید وہ نوجوان، آزاد خیال لڑکیاں تھیں جو خوبرو ہونے اور پرکشش جسموں کی مالک ہونے کے علاوہ فیشن اور آزادروی میں دلّی کی لڑکیوں کے بھی کان کاٹتی تھیں!

مگر کسی بھی دوسرے ہندوستانی شہر کی مانند فرخ نگر کی پھیلی خوشحالی کی چادر کے پیچھے ایک بہت بڑا اور بدنما ٹکڑا بدحالی اور بدبختی کا بھی تھا۔ بظاہر ایسے لوگوں کی سرگرمی میں بھی اضافہ ہو گیا تھا مگر جانے کیوں اس طبقے کی حالت کیوں نہیں سدھری تھی۔ اس میں ہندو اور مسلمان دونوں شامل تھے۔ ہندوؤں کی آبادی مسلمانوں کے مقابلے میں قدرے زیادہ تھی مگر مسلمان زیادہ بدحال تھے۔ شاید وہ زیادہ قدامت پسند تھے اور اپنا پیشہ آسانی سے نہیں بدلتے تھے۔ یہ تناسب خوشحال طبقے میں بہت زیادہ نمایاں تھا۔ امیر اور خوشحال طبقے میں مسلمانوں کی گنتی دس فی صدی سے زیادہ نہیں تھی مگر جو امیر تھے وہ ہندوؤں کی ٹکرّ کے تھے۔

یہ تصویر نامکمل رہے گی اگر ہم مادی ترقی کے نتائج کے ایک اہم پہلو سے چشم پوشی کریں اور وہ ہے عیاشی اور اس سے بڑی فیشن زدگی اور حسن وعشق کی نمائش۔ اب وہ محبت تو ہوا ہو گئی ہے جو پاک جذبات پر مبنی ہوتی تھی اور جس کی شدت اور قربانی کو شمع اور پروانے سے تعبیر کیا جاتا تھا۔ آج کے دولتمند سماج میں 'حسن وعشق' کے لیے بیوی بچوں کی موجودگی بھی مانع نہیں ہے۔ ہمارے لڑکوں اور لڑکیوں کی پرورش ایسے ماحول میں ہوتی ہے کہ ذرا سے بالغ ہوئے نہیں کہ 'محبت' کی تلاش میں بری طرح سرگرداں رہنے لگے۔ ان جذبات کی فراوانی کے لیے ذمے دار ہیں، ہمارے گھروں میں بغیر سنسرشپ کے سنیما کا داخلہ یعنی ٹی۔وی اور کیبل کی مہربانی سے دنیا بھر کے سیریز، پاپ میوزک اور فیشن شوز جنہیں دیکھنے کا پہلے تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا مگر جنہیں آج ہمارے لڑکے، لڑکیاں اور مستورات دن رات دیکھتے رہتے ہیں۔ اور وہ بہت ہی بے ضرر اور مفید ایجاد جسے ہم ٹیلیفون کہتے ہیں۔ نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کے درمیان رابطے کا بہت بڑا اور آسان وسیلہ بنا ہوا

ہے۔ جب تک بات کرنے کا موقع نہ میسر ہو عشق پروان نہیں چڑھتا مگر آج فون پر اپنے کمرے کی تنہائی میں لڑکا اور لڑکی جب تک چاہیں بات کر سکتے ہیں اور جس بات کو منہ پر کہنے کے لیے ڈھیروں حوصلے کی ضرورت تھی، وہ فون پر بلا جھجک آسانی سے کہی جا سکتی ہے! اور مزید فائدہ یہ کہ ماں باپ کو پتہ بھی نہیں لگتا!!

مذہب نے شاید ان ایجادوں کے بارے میں سوچا نہیں تھا۔ اس لیے کہ مذہب محافظ کسی قسم کی روک تھام ان حالات کے لیے مہیا نہ کر سکے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دولت اور مرتبہ ایک ایسی مشترکہ سطح تعمیر کر دیتے ہیں جہاں سب مذاہب کے پیروکار ایک ہی طریق زندگی اختیار کر لیتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں جہاں تک نمود و نمائش، گناہ اور مجرمانہ خصلت کا تعلق ہے مذہب ایک کچی دیوار ثابت ہوتا ہے، اس طبقے کے افراد کے لیے۔ فرخ نگر کے امیر ہندوؤں اور مسلمانوں کی زندگی اور طریق کار بھی جو نہرو نگر میں رہتے تھے ایک سا ہی تھا۔ امیر گھروں کی مسلم نوجوان لڑکیاں بھی برقعے کو خیر باد کہہ چکی تھی اور وہی لباس پہنتی تھیں جو ان کی امیر ہندو سہیلیوں کو مرغوب تھا۔ یہی نہیں بلکہ جوان جہاں مسلم لڑکیوں کو نہرو نگر میں صبح سویرے پیشہ ور ڈرائیوروں سے کار چلانا سیکھتے ہوئے بھی دیکھا جا سکتا تھا! کم از کم چار پانچ مسلم گھرانے نہرو نگر میں ایسے تھے جن کی مستورات سماجی سطح پر ہر پہلو سے اپنے ہندو پڑوسیوں کی عورتوں کے مدِ مقابل کھڑی ہو سکتی تھیں۔

فرخ نگر میں کالج ایک ہی تھا مگر تھا ایم۔ اے تک۔ یہ کالج نہرو نگر سے دو کلو میٹر دور شمال کی طرف تھا اور اس میں لڑکے اور لڑکیاں دونوں پڑھتے تھے۔ مگر سارے کالج میں لڑکیوں کی تعداد پانچ سو لڑکوں کے مقابلے میں صرف پندرہ تھی۔ ان میں مسلم لڑکیاں تین تھیں۔ جو نہرو نگر سے اپنی اپنی ماروتی کاروں میں آتی تھیں۔ ان کے نام تھے ثمینہ، صنوبر اور کہکشاں۔ یہ تینوں ملیے قد کی، پتلی دبلی اور نہایت حسین تھیں۔ آزاد خیال اور فیشن ایبل بھی تھیں اور انگریزی روانی سے بولتی تھیں۔ عمر انیس بیس سال سے زیادہ نہیں ہوگی۔ ان کی دو سہیلیاں تھیں، کاجل اور سیما۔ وہ بھی نہرو نگر کی ہی تھیں اور ان کا شمار کالج کی حسین ترین لڑکیوں میں ہوتا تھا بے حد باتونی اور چلبلی تھیں اور زور سے ہنستی تھیں تو دور تک کھڑے ہوئے لڑکے بھی مڑ کر دیکھتے تھے۔ جنیز اور بلاؤز کے سوا کچھ نہ پہنتی تھیں مگر ان کی وضع قطع میں ہر روز ایک ہوشربا فرق ہوتا تھا۔

ثمینہ اور کاجل وہی سیدھی سادی معصوم لڑکیاں تھیں جن کا سارا بچپن فرخ نگر کی تنگ گلیوں اور گنجان محلوں میں گزرا تھا۔ اُف دولت یہ زمانہ کسی قیامت کی چال چل گیا تھا!

پرانے فرخ نگر میں جس گلی میں انور کا گھر تھا اسی کے آخر میں ثمینہ کا مکان تھا۔ انور کوئی تیرہ سال کا تھا اور ثمینہ کوئی گیارہ کی ہوگی اور ثمینہ اس وقت تک گلی کے دوسرے بچوں کے ساتھ جن میں انور بھی ہوتا تھا کھیلتی رہی تھی۔ یہ اتفاق تھا یا کسی بھی معصوم کشش کی ابتدا کہ ثمینہ انور سے زیادہ بولتی تھی اور انور بھی ثمینہ کو پسند کرتا تھا۔ بچے اگر دو ٹیموں میں بنٹ کر کوئی کھیل کھیلتے تو انور اور ثمینہ دونوں ایک ہی ٹیم میں رہنے کی کوشش کرتے تھے۔ انور ماسٹر عطا اللہ کا لڑکا تھا جو قدسیہ مڈل اسکول میں ٹیچر تھے۔ ماسٹر عطا اللہ کے دو بیٹے اور تھے جو انور سے چھوٹے تھے۔ ثمینہ شیخ احمد بخش کے چار بچوں میں سب سے چھوٹی اور اکلوتی بیٹی تھی۔ شیخ احمد بخش کوئی چھوٹا موٹا کاروبار اس وقت بھی کرتے تھے اور مالی طور پر گلی کے دوسرے لوگوں سے کہیں بہتر تھے۔ مگر طرزِ رہائش میں کوئی نمایاں فرق نہیں تھا۔

مگر جانے پھر کیا ہوا تھا کہ احمد بخش کو ان کے ایک سالے نے جو مراد آباد میں پیتل کے برتنوں کا کاروبار کرتا تھا مراد آباد بلوالیا۔ وہاں پتہ نہیں کیا کاروبار شروع کیا کہ وارے نیارے ہوگئے۔ ویسے بھی مثل مشہور ہے کہ خدا جس کو دیتا ہے چھپّر پھاڑ کر دیتا ہے۔ ابھی کوئی سال بھر ہوا کہ وہ آٹھ نو سال کے بعد فرخ نگر لوٹ آئے مگر نہرو نگر میں جہاں انہوں نے ایک شاندار کوٹھی خرید لی تھی۔ مراد آباد کا بزنس بھی ختم نہیں کیا تھا کیونکہ دو بڑے بیٹوں کی شادیاں ہوگئی تھیں اور وہاں کا بزنس انہیں سونپ آئے تھے۔ مگر فرخ نگر میں جو ان کا نیا ٹھاٹھ باٹھ تھا اور اعلیٰ زندگی کا جو معیار انہوں نے اپنی کوٹھی میں قائم کیا تھا وہ شادی شدہ بیٹے بھی یہاں آکر دیکھ گئے تھے۔

اُن کے فرخ نگر لوٹنے کا گلی کے کسی آدمی کو کوئی علم نہیں تھا۔ وہ یہاں کسی سے ملنے بھی نہیں آئے۔ گلی والے ان آٹھ نو سالوں کے عرصے میں انہیں موقع بہ موقع یاد کر لیتے تھے۔ انور تو وہ دن آج بھی نہیں بھولا تھا جب فرخ نگر کو چھوڑتے وقت ثمینہ دوڑ کر انور سے ملنے اُسے کے گھر چلی آئی تھی اور ایک انجانے پیار اور انس کے جذبے نے دونوں کی آنکھوں کو نم کر دیا تھا۔ انور اُس روز سارا دن بے چین رہا تھا۔

انور کا ایک دوست تھا نودکمار جو کچھ ہی دور محلّہ کیدارہ میں رہتا تھا۔ دونوں ایک

ہی اسکول میں اور ایک ہی کلاس میں پڑھتے تھے اور ہر روز کا ملنا جلنا تھا۔ اس کے باپ سیتا رام کی بازار میں واحد کیمسٹ کی دکان تھی اور اچھے کھاتے پیتے لوگ تھے۔ ونود کی ہی گلی میں عین اُن کے سامنے ان کا گھر تھا۔ سیتارام کی لڑکی کاجل چھٹی جماعت میں لڑکیوں کے مڈل اسکول میں پڑھتی تھی اور زیادہ سے زیادہ بارہ تیرہ سال کی ہوگی۔ اس کے دو بڑے بھائی اور تھے۔ سیتارام نے ایک پرانی فی۔ ایٹ کار ایک سال ہوئے خرید لی تھی مگر گلی اتنی تنگ تھی کہ گاڑی اندر نہیں آسکتی تھی اور گلی کے باہر ایک کھلی جگہ پر درخت کے تلے کھڑی رہتی تھی۔

کاجل پتلی دبلی خوبصورت لڑکی تھی جس کی سب سے بڑی کشش اس کی بڑی بڑی آنکھیں تھیں۔ ونود اس سے ایک دو سال بڑا ہوگا۔ اس عمر میں گلی محلے کے سارے لڑکے لڑکیاں اکٹھے ہی کھیلتے ہیں۔ ونود کاجل کو بڑا پسند کرتا تھا اور شاید کاجل کو بھی ونود اچھا لگتا تھا۔ کھیلتے کھیلتے انجانے میں دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ بھی تھام لیتے تھے۔ جانے چند سالوں پر ہی مشتمل وقت کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے میں ہی سیتارام نے اتنا روپیہ کہاں سے پیدا کر لیا کہ اس نے نہرو نگر میں ایک بڑا پلاٹ خرید کر ایک عالیشان کوٹھی تعمیر کروالی اور اپنی گلی کا مکان بیچ کر وہاں ـــــ منتقل ہوگیا۔ پرانی گاڑی کی بجائے اب ان کے پاس ایک چمچاتی بڑی کار سیلو تھی اور کوئی ایسا جدید آرائش اور آسائش کا سامان ایسا نہ تھا جو نئی کوٹھی کے لیے خریدا نہ گیا ہو۔ جس روز کاجل کے گھر والے پرانے فرخ نگر کو چھوڑ کر جا رہے تھے تو گلی کے بہت سے لوگ اپنے گھروں کے باہر کھڑے تھے اور بہت سی عورتوں کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔ جب کاجل باہر نکلی تو ونود جانے کیوں اپنے گھر کے اندر چلا آیا شاید وہ کاجل کے یہاں سے جانے کو برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ مگر کاجل ونود کو ڈھونڈتی ہوئی ونود کے گھر میں ہی چلی آئی اور ایک کونے میں چپ چاپ کھڑے ہوئے ونود سے بولی۔

''ونود میں جا رہی ہوں۔ میں تم سے یہ کہنے آئی ہوں کہ میں سب سے ملنے یہاں آتی رہوں گی اور تم بھی ہمارے نئے گھر آنا۔''

ونود نے سر اٹھا کر دیکھا۔ جہاں وہ بے حد اداس تھا وہاں کاجل کے چہرے پر کوئی نمایاں جذبہ نہیں تھا مگر ایک معصوم سی شادمانی کی جھلک تھی۔ پھر بھی اُس نے اپنا ہاتھ بڑھا کر ونود سے ہاتھ ملایا اور باہر نکل گئی۔

ونود کے ذہن پر کچھ دنوں تک اُداسی چھائی رہی اور اسے کاجل یاد آتی رہی مگر

آہستہ آہستہ حالات معمول پر آ گئے ثمینہ تو خیر یہ شہر چھوڑ ہی چکی تھی اور انور کے لیے کسی قسم کے نامہ و پیام کا سوال ہی نہیں تھا مگر کاجل بھی پھر کبھی اپنے محلے میں لوٹ کر نہیں آئی۔ ونود نے بھی کبھی کاجل کی طرف جانے کی کوشش نہیں کی۔ اُس کا دل تو کئی دفعہ مچلا مگر نہ اُسے اس کے مکان کا نمبر پتہ تھا اور نہ اسے اس بارے میں کچھ پوچھنے اور وہاں جانے کی ہمت ہوئی۔ رفتہ رفتہ کاجل بھی اس کے ذہن سے محو ہو گئی۔

پھر کوئی سات آٹھ سال کے وقفے کے بعد جب انور اور ونود نوجوانی کی سرحد میں داخل ہو چکے تھے اور گورنمنٹ کالج فرخ نگر میں بی۔اے فائنل ایر میں پڑھ رہے تھے تو کچھ عجیب سے حالات میں ان کی ملاقات ثمینہ اور کاجل سے ہو گئی!

کالج میں فرسٹ ایر میں نئے داخلے شروع ہو گئے تھے۔ ان داخلوں میں، پانچ لڑکیاں بھی تھیں جن میں دو لڑکیاں ثمینہ اور کاجل نہرو نگر کی ہی تھیں۔ اب کالج میں لڑکیوں کی تعداد پندرہ ہو گئی تھی جو اب تک کا ریکارڈ تھا۔ نہرو نگر کی کل ملا کر پانچ لڑکیاں تھیں۔ یہ لڑکیاں یا تو خود اپنی کار چلا کر کالج آتی تھیں یا ان کے ڈرائیور انہیں چھوڑنے اور لینے آتے تھے۔ یہ سب لڑکیاں ماڈرن اور فیشن ایبل تھیں اور وہ جدھر جاتیں لڑکوں کی حریص نظریں ان کا تعاقب کرتیں۔ انور اور ونود کو چند مہینوں تک یہی پتہ نہیں لگا کہ ثمینہ اور کاجل اس کالج کی طالبات تھیں۔ ایک تو ان کی کلاسیں کالج کے دوسرے بلاک میں لگتی تھیں دوسرے وہ اپنی پڑھائی میں زیادہ دلچسپی لیتے تھے کیونکہ وہ مالی طور پر اوسط گھرانوں سے تعلق رکھتے تھے اور اُن کے والدین ان سے امید بھی لگائے بیٹھے تھے۔

ایک روز کالج کی لٹریری سوسائٹی کی طرف سے ایک بحث کا اہتمام کیا گیا۔ موضوع تھا 'میرے مستقبل کے خواب' اس بحث میں دو ٹیموں نے حصہ لیا تھا۔ یہ چار منتخب لڑکوں اور اسی تعداد میں لڑکیوں پر مشتمل تھیں۔ بحث کالج کے اوقات کے بعد پانچ بجے شام کو شروع ہونی تھی اور اس میں کالج کے تمام پروفیسروں اور طلبا کو آنے کی دعوت عام تھی اور نوٹس بورڈ پر کئی دن پہلے سے نوٹس بھی لگا دیا گیا تھا۔ وقت سے پہلے ہی ہال بھر گیا تھا اور انور اور ونود بھی ہال کی اگلی سیٹوں میں برابر برابر بیٹھے تھے۔

یہ بحث ایک سے زیادہ پہلوؤں سے انور اور ونود کے لیے آنکھ کھولنے والی تھی۔ ایک تو اس بحث میں حصہ لینے والی چاروں لڑکیاں نہایت جاذب نظر اور فیشن زدہ تھیں جو

تنگ جینز اور ان سے زیادہ تنگ اور چھوٹا بلاؤز پہنے ہوئے تھیں نیز وہ اسٹیج پر بیٹھے ہوئے پروفیسروں اور مخالف ٹیم کے لڑکوں سے نہایت شوخی سے اور اترا اترا کر بات کر رہی تھیں۔ پہلے ونود نے غور سے دیکھا تو اسے ایک لڑکی کے خدو خال میں کاجل کی جھلکی نظر آئی اور دوسرے ہی لمحے انور کو شک ہوا کہ وہ تڑک بھڑک والی، چلبلی اور شوخ لڑکی شاید ثمینہ تھی۔ مگر جب اسٹیج پر بحث میں حصہ لینے والے لڑکوں اور لڑکیوں کے نام لیے گئے تو ان کا شبہہ یقین میں بدل گیا اور ان کے دل زور سے دھڑکنے لگے۔

یہ موضوع دراصل بحث کا تھا ہی نہیں کیونکہ بحث کے لیے تو وہ موضوع چنا جاتا ہے جس کے حق میں اور جس کے خلاف بولا جا سکتا ہے اور مخالف ٹیمیں حق میں یا خلاف بولتی ہیں۔ آج کے پروگرام میں لڑکوں اور لڑکیوں کی ٹیم کے لیڈر نے دس دس منٹ کے لیے موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار کرنا تھا۔ اس کے بعد دوسری ٹیم کے ممبر کچھ الجھا دینے والے یا نیچا دکھانے والے سوالات پوچھ سکتے تھے اور اس طرح سے یہ مقابلہ ایک بحث کی شکل اختیار کر سکتا تھا۔

لڑکیوں کی ٹیم کی لیڈر ثمینہ تھی اور وہ بولنے سے پہلے کاجل اور دوسری ٹیم کی لڑکیوں سے تبادلۂ خیالات میں مصروف رہی۔ لڑکوں کی ٹیم کے لیڈر نے پہلے ایک عام سی تقریر کی۔ تالیاں تو بجیں مگر جب ثمینہ بولنے کے لیے کھڑی ہوئی تو اس کا مسلسل تالیوں اور کچھ سیٹیوں سے زوردار خیر مقدم ہوا۔ اس نے اپنی تقریر میں ایسے بے باک خیالات پیش کیے کہ سب چونک گئے۔ لڑکوں کی ٹیم نے ان خیالات کو ہندوستانی تہذیب اور روایتوں کے خلاف بتایا اور ان لڑکیوں کو مغرب زدہ ماڈل تک کہہ دیا جس پر بڑا ہنگامہ ہوا اور ثمینہ کی مدافعت کے لیے کاجل اسٹیج پر کود پڑی اور ثمینہ سے بڑھ کر آزاد خیالی اور بے باکی کا مظاہرہ کیا جس پر لڑکوں نے اسے ہوٹ تک کیا اور ماحول پھر گرما گیا۔ چونکہ مستقبل کے خوابوں کا ذکر تھا، مخالف لڑکوں کی ٹیم کے ایک ممبر نے لڑکیوں سے شادی اور شریک حیات کے بارے میں ان سے اشتعال انگیز سوال کر ڈالا۔ اس کو سنتے ہی لڑکیوں کی ٹیم کی لیڈر یعنی ثمینہ خود میدان میں بپھر کر کود پڑی اور انتہائی جرأت اور بے باکی سے بولی۔

''ہم محبت کے ڈھکوسلے اور فرسودہ روایتوں میں یقین نہیں رکھتیں۔ میں اپنی زندگی کا ہمسفر اُسے منتخب کروں گی جو مجھے مکمل آزادی سے جینے دے۔ جس کی آمدنی باعث

رشک ہو اور جو چمچاتی گاڑیوں اور بنگلے کا مالک ہو۔"

"اور وہ چاہے بوڑھا کھوسٹ ہو؟" کوئی لڑکا ہال میں سے پوچھ بیٹھا۔

یہ سوال شاید سٹیج تک بھی نہیں پہنچا کیونکہ ہر طرف ہنگامہ بپا ہو گیا اور چند منٹ تک بے ہنگم شور اور سیٹیوں کے سوا کچھ نہ سنائی دیا۔ پھر کالج کے وائس پرنسپل نے اٹھ کر ہال میں بیٹھے لڑکوں سے اپیل کی کہ وہ خاموش ہو جائیں۔ جب اس کا اثر ہوا تو انہوں نے زیادہ اچھا اور پر اثر بولنے والی لڑکیوں اور لڑکوں کو انعام دیئے اور جلسہ اختتام کو پہنچا۔

انور اور ونود ثمینہ اور کاجل کے ملبوسات کو دیکھ کر اور ان کے خیالات کو سن کر سکتے میں آ گئے تھے۔ انہوں نے رُک کر ثمینہ اور کاجل سے کالج کے ہال سے باہر ملنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ انہیں ایسا لگا تھا کہ وہ کسی لق و دق صحرا میں کھڑے تھے، اور مسموم ہوائیں ان کے جسموں پر تھپیڑے مار رہی تھیں۔ وہ ہزیمت خوردہ سے ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر پرانے فرخ نگر کی طرف چل پڑے۔

کچھ دنوں بعد کی بات ہے کہ ثمینہ کالج کی لائبریری سے باہر نکل رہی تھی اور انور لائبریری میں داخل ہو رہا تھا۔ دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں مگر ثمینہ ایک لمحے کے لیے ٹھٹکی مگر پھر آگے بڑھ گئی۔ انور کے دل کو بڑا دھکا لگا اور وہ لائبریری کے دروازے سے باہر نکل آیا۔ اس نے دیکھا کہ چند قدم پر ثمینہ بھی رک گئی تھی اور مڑ کر دیکھ رہی تھی۔ وہ انور کی طرف بڑھی اور پاس آ کر بولی۔

"کیا تم انور ہو جو فرخ نگر کی گلی لوہاراں میں رہتے تھے؟"

"جی ہاں" انور نے مختصر سا جواب دیا اور ثمینہ کے چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔ کل کا معصوم اور کلی کی طرح خوبصورت چہرہ خوفناک حد تک دلکش اور آتشی ہو گیا تھا۔ اتنی خوبصورتی اور پھر شباب کا یہ عالم، یہ تاثر تو ناگزیر تھا۔ انور نے محسوس کیا کہ اُس کے سامنے پورا کھلا ہوا گلاب کا پھول تھا جو ایک ہری بھری شاداب ٹہنی پر جھوم رہا تھا اور ٹہنی بھی کتنی سیدھی اور لچکیلی تھی!

"کیا تم اب بھی وہیں رہتے ہو؟"

"جی ہاں۔ اسی کالج میں بی۔ اے فائنل میں ہوں۔"

"او۔ کے بائی۔" ثمینہ نے مسکرا کر کہا اور واپس مڑ گئی۔

اور انور کو محسوس ہوا کہ اسے کوئی دھکا مار کر گرا گیا ہے!

ونود کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ ایک روز وہ کالج کچھ پہلے ہی پہنچ گیا۔ سائیکل سٹینڈ پر اپنی سائیکل رکھ کر وہ کالج کے برآمدے میں چڑھا ہی تھا کہ پیچھے سے ایک چمچاتی کار آئی اور اس نے مڑ کر دیکھا تو اس میں سے کاجل اتری۔ صبح کی تازگی اور خوشگوار ہوا میں ایک لہراتا ہوا خوشنما پھول۔ کاجل نے ونود کو دیکھا مگر شاید پہچان نہیں پائی اور وہ نیچی نظر کر کے اس کے پاس سے گزر جانا چاہتی تھی کہ ونود بولا۔

''سنیئے اگر میں غلطی نہیں کرتا تو آپ کاجل ہیں جو پرانے فرخ نگر میں محلہ کیدارہ میں رہتی تھیں۔''

کاجل نے اپنی ستارہ سی آنکھیں ٹمٹمائیں اور ونود کو غور سے دیکھ کر بولی۔

''تم؟۔ تم ونود ہو۔ کتنا بدل گئے ہو۔ کیا اسی کالج میں پڑھتے ہو؟''

''جی ہاں۔ میں بی۔ اے فائنل ایر میں ہوں۔''

''اب کہاں رہتے ہو؟''

''اُسی مکان میں' اسی گلی میں۔ پتاجی ریٹائر ہو گئے ہیں۔'' ونود آہستہ سے بولا

''اچھا تو میں چلوں۔ بائی۔''

کاجل نے ایک دلفریب انداز میں مسکرا کر کہا اور ونود کو محسوس ہوا کہ اس کے نیچے سے زمین سرک گئی ہے!

کوئی پندرہ بیس دن بعد کی بات ہے، انور اور ونود کالج کے باہر بڑی سڑک پر کسی بس یا ٹیمپو کی انتظار میں کھڑے تھے۔ وہ آج سائیکل نہیں لائے تھے اور ٹیمپو اور بس والے صرف دو روپے میں فرخ نگر کے بس اسٹاپ پر چھوڑ دیتے تھے۔ اچانک ایک ہرے رنگ کی بڑی کار جو کالج کی طرف سے آ رہی تھی ان کے پاس آ کر رک گئی۔ اسے کاجل چلا رہی تھی اور ثمینہ اس کے برابر والی سیٹ پر بیٹھی تھی۔ پیچھے کی سیٹ پر بھی کالج کی ہی کوئی اور لڑکی بیٹھی ہوئی تھی۔ چونکہ کار کا اے۔ سی چل رہا تھا، اس لیے کار کے شیشے اوپر چڑھے ہوئے تھے۔ کاجل نے اپنا شیشہ اتارتے ہوئے ونود سے کہا۔

''آپ اور آپ کے یہ دوست اگر فرخ نگر جا رہے ہیں تو آ جائیے ہم آپ کو چھوڑ دیں گے۔''

گاڑی کے رکتے ہی انور اور ونود گاڑی کے اگلے دروازے پر پہنچ گئے تھے اور انہوں نے جھک کر ثمینہ کو بھی دیکھ لیا تھا ثمینہ نے انور کو 'ہیلو' بھی کہا تھا۔ثمینہ نے مزید یہ کہا۔

''مگر ہم آپ کو اس بستی میں نہیں چھوڑ سکتے جہاں آپ لوگ رہتے ہیں۔ وہاں جانے سے تو دم گھٹتا ہے۔''

''اُدھر تو کار کا چلانا بھی ناممکن ہے۔ بڑے ان پڑھ اور جاہل لوگ ہیں، ہارن سن کر بھی راستہ نہیں دیتے'' کاجل بولی ''ہم آپ کو پٹرول پمپ پر اتار سکتے ہیں۔''

ونود کا ارادہ کار میں بیٹھ جانے کا تھا اور وہ پچھلے دروازے کی طرف مڑا بھی مگر انور نے اُسے روک دیا اور کاجل سے بولا

''آپ چلیے۔ہم نہیں جائیں گے۔گاڑی روکنے کے لیے شکریہ''

''ونود یہ بدتمیز لڑکیاں ہماری منزل نہیں ہو سکتیں۔عیش اور دولت کی فراوانی نے ان کا دماغ خراب کر دیا ہے۔''

اتنے میں پیچھے سے ایک ٹیمپو کھڑ کھڑ کرتا ہوا ان کے پاس آکر رُک گیا اور وہ دونوں کھوئے ہوئے سے اس میں چڑھ گئے!

وقت کی اُڑان

اپنے سفر کے دوران جب میں وجے نگر سے صرف پانچ میل کے فاصلے پر بلرام پور گاؤں میں ٹھہرا تو اچانک یاد آیا کہ وجے نگر میں تو پارو ہے۔ میں شام کو ہی ایک یکّے میں بیٹھ کر وجے نگر کی طرف چل پڑا۔ یکّہ کوئی ایک میل چلا ہوگا کہ بارش کے سے آثار پیدا ہو گئے اور موسم اچانک ٹھنڈا ہو گیا۔ گھوڑا اس سہانے موسم میں بھاگا جارہا تھا اور میں خیالات میں ڈوبا ہوا تھا۔ پارو سے میری یہ ملاقات کوئی تیس سال بعد ہوگی۔ کہاں وہ بچپن کی بات اور کہاں بڑھاپے کی یہ منزل۔ پارو بھی اب کوئی پچاس سال کی ہوگی۔ اگر چہ میری نظروں میں اُس کے بچپن اور نوجوانی کا چہرہ جوں کا توں موجود تھا مگر بڑی عمر کی اس منزل میں بچپن اور نوجوانی کی منزلیں کچھ ایسی گم ہو جاتی ہیں جیسے کبھی تھیں ہی نہیں۔

پارو کے ساتھ صرف یہی تعلق نہیں تھا کہ وہ ہمارے ساتھ کے مکان میں رہنے والی گاؤں کی ایک لڑکی تھی بلکہ اس سے کہیں زیادہ تو وہ میرے لیے ایک بہن تھی۔ وہ میری بہنوں کی سہیلی تھی اور اس کا زیادہ تر وقت ہمارے گھر میں ہی گزرتا تھا۔ میں کیونکہ گھر میں اکیلا ہی تھی یعنی میرا کوئی بھائی نہیں تھا۔ اس لیے اپنی بہنوں سے ہی گھلا ملا رہتا تھا۔ شام کو ہم سب اکٹھے بیٹھتے، پارو بھی آجاتی، بہت دیر تک ہم ادھر اُدھر کی گپ مارتے اور ہنستے۔ یہ کوئی ایک دن کی بات نہیں تھی۔ اسی طرح وقت کے بیس پچیس سال گزر گئے۔ یہاں تک کہ بہنوں کی شادی ہوگئی اور پارو بھی اسی بندھن میں بندھ گئی۔ پارو کا بیاہ ہوا تو پاس کے ہی ایک قصبے میں تھا لیکن بعد میں اس کے شوہر کی بدلی کلکتہ کی

طرف ہوگئی۔ اس کے ایک دو سال بعد ہی پارو کا باپ گزر گیا اور وہ اس کے بعد پھر کبھی گاؤں نہیں آئی… پارو کی ماں تو اس کے بچپن میں ہی چل بسی تھی اور اس کا کوئی اور بہن بھائی نہیں تھا۔ دھیرے دھیرے ہم بھی اسے بھول سے گئے۔ ابھی کوئی دو سال ہوئے مجھے سہرام پور میں گاؤں کے ایک آدمی نے بتایا تھا کہ پارو اور اس کا شوہر شنکر وجے نگر میں رہتے ہیں۔ شنکر وجے نگر میں ٹیوب ویلز کا چھوٹا انجینئر ہے۔

میرا ایکہ جب وجے نگر میں داخل ہوا تو بونداباندی شروع ہوگئی۔ وقت تو سات سے زیادہ کا نہیں تھا لیکن چاروں طرف اندھیرا چھانے لگا تھا۔ اُدھر آسمان میں گھٹا ٹوپ بادل گھر آئے تھے اور بیچ بیچ میں بجلی چمک رہی تھی۔ یکّے والا وجے نگر کا ہی تھا اور وہ ایک پھیرا بلرام پور کا ابھی اور لگاتا لیکن موسم خراب ہوجانے کی وجہ سے اُس کا ارادہ اب گھوڑا کھولنے کا تھا۔ وہ شنکر کا مکان جانتا تھا اس لیے اس نے مجھے سیدھا وہاں پہنچادیا۔

شنکر اور پارو گھر پر ہی تھے۔ وقت کتنا بھی پر لگا کر اڑ جائے اور ایک زمانہ ہی کیوں نہ بیت جائے، سچّی محبت اور پیار کبھی نہیں مٹتا۔ پارو نے جب سنا کہ میں آیا ہوں، وہ بھاگتی ہوئی اندر سے آئی، مجھے دیکھ کر کچھ ٹھٹھکی اور پھر ہنس پڑی۔ میں نے بھی اس کی طرف کچھ اسی ڈھنگ سے دیکھا یہ اتفاق پہلی بار ہوا تھا کہ وقت چھلانگیں مارتا ہوا اوپر سے گزر گیا تھا اور آج پھر ہم دونوں اس موڑ پر اکٹھے ہوگئے تھے۔ تیس سالوں کے لمبے عرصے نے، اور وہ بھی جو نوجوانی کے بعد بیتا ہو، ہم دونوں کو اتنا بدل ڈالا تھا کہ اگر جذبات ساتھ نہ دیتے تو غالباً ایک دوسرے کو پہچان بھی نہ پاتے۔ کہاں تیس سال پہلے کی پارو، کسی جھومتی ہوئی نرم شاخ کی مانند پتلی دبلی اور لمبی شرمیلی لڑکی اور کہاں یہ تیس برس بعد کی پارو کتنی موٹی ہوگئی تھی۔ اس کے اس وقت کے چہرے میں ناک، آنکھ کے سوا سب کچھ وقت کے بے رحم ہاتھوں نے بدل دیا تھا۔ یقیناً اس کی نظروں میں میری حالت بھی یہی ہوگی۔ کچھ بھی ہو وقت نے جذبات کی گرمی کو ابھی ٹھنڈا نہیں کیا تھا۔ ہم ایک دوسرے کو دیکھ کر بہت ہی خوش ہوئے۔ پارو مجھے اندر لے گئی میرے بیٹھنے کے کچھ ہی لمحوں کے بعد وہ میرے لیے ایک گلاس میں گرم گرم دودھ لے آئی اور میں صرف مسکرا کر رہ گیا۔ پارو کو شاید یہ یاد تھا کہ مجھے بچپن سے ہی دودھ پینے کا بڑا شوق تھا۔

ہم سب اکٹھے وہیں بیٹھ گئے۔ بات چیت اور سوال جواب نے بہت ہی یادوں کو

کرید کر پھر سے زندہ کر دیا۔ پارو بولی...

''اور منی، رکشا، چھوٹی اور کنتی تو ٹھیک ٹھاک ہیں؟

آپ نے مجھے رکشا کی شادی کی خبر تک نہیں بھجوائی''

''بہت کوشش کی لیکن تمہارا کچھ پتہ ہی نہیں لگا۔''

میں نے جواب دیا۔

''رکشا مان گئی تھی شادی کے لیے؟'' پارو نے پوچھا۔

''کنتی کہتی تھی کہ میں شادی کبھی نہیں کراؤں گی۔''

''وہ تو بچپن کی بات تھی۔'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''تم بھی تو رکشا کی ہی طرح شادی کے لیے منع کیا کرتی تھیں۔''

میری اس بات پر وہ ہنس پڑی، ہم سب کافی دیر تک ادھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ رات کو کھانے پر اکٹھے بیٹھے تو میں نے احساس کیا کہ پارو کی زندگی کافی آسودہ ہے، اس کے دو لڑکے اور ایک لڑکی تھی۔ بڑا لڑکا بھی پٹنہ میں انجینئر تھا اس کی اور ایک لڑکی کی شادی وہ کر چکے تھے۔ اس وقت یہاں ان کے پاس ان کی لڑکی مایا بھی آئی ہوئی تھی۔ دوسرا لڑکا انجینئرنگ کا کورس کر رہا تھا۔ لڑکی بالکل ایسی تھی جیسی کبھی پارو ہوا کرتی تھی اس کی سال بھر کی بڑی پیاری گڑیا سی بچی تھی۔

اُس دن ہم رات کو کوئی بارہ بجے سوئے ہوں گے۔ تیس سالوں کی گود میں کیا کچھ نہیں سمایا تھا اور پچھلی باتیں کرتے کرتے اتنا وقت تو لگ ہی جانا تھا۔ بچپن میں پڑی ہوئی کچھ عادتیں شاید بڑھاپے میں بھی نہیں بدلتیں۔ پارو کو، میری سب بہنوں کو اور خود مجھے رات گئے تک باتیں کرنے کی عادت تھی۔ ہم سب رات کو بیٹھ جاتے تو پھر وقت کا پتہ ہی نہیں لگتا تھا۔ اکثر آدھی رات ہو جاتی تھی اور پارو میری بہنوں کے ساتھ ہی سو جاتی تھی۔

ایک بات جو شاید پارو کو نہیں معلوم تھی وہ یہ تھی کہ میری شادی نہیں ہوئی تھی۔ اس نے ایک دو بار اپنی اس بھابھی کی بات کرنی چاہی جو کبھی تھی ہی نہیں، مگر میں کچھ بتائے بغیر ٹال گیا۔ پارو شاید یہ سمجھ بیٹھی کہ میری بیوی فوت ہو چکی ہے اسی لیے اس نے بھی بات کو آگے نہیں بڑھایا۔

اگلے دِن مجھے بلرام پور لوٹنا تھا کیونکہ پھر اُسی روز وہاں سے اپنے سفر کی دوسری

منزل کی طرف چل پڑتا تھا اس طرف صرف پارو سے ملنے آیا تھا اور وہ مقصد پورا ہو گیا تھا۔
میں نے اگلے دن صبح سویرے شنکر اور پارو سے جانے کی اجازت مانگی مگر دونوں ضد کرنے لگے کہ کچھ دن اور ٹھہروں۔ وہ کہنے لگے کہ اتنی دور بار بار تو آنا نہیں ہوتا اور اب آیا ہوں تو چند دن تو ٹھہر جاؤں۔ مگر میں بھی مجبور تھا، ان کی خواہش کا احترام نہ کر سکا۔ ہاں صبح کی بجائے تیسرے پہر جانے کے لیے مان گیا۔ اُس دن پارو نے میری خاطر تواضع میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ میری پسند کی چیزیں تیار کیں اور کھلائیں۔ شنکر نے صرف میری وجہ سے چھٹی لے لی تھی۔ وہ مجھے کچھ پرانے تاریخی کھنڈرات بھی دکھانے لے گیا۔ جب ہم دوپہر کا کھانا کھا رہے تھے تو پارو بولی۔

''بھیا جب سب بہنیں گھر پر اکٹھی ہو جاتی ہوں گی تو کتنی رونق ہوتی ہو گی۔ ان سے ملنے کو بڑا جی کرتا ہے۔ اب جب ہولی، دیوالی یا کسی دوسرے موقع پر سب بہنیں آئیں تو مجھے بھی بلوا لیجیے گا۔''

میں کچھ لمحوں کے لیے خاموش ہو گیا۔ پارو نے یہ کہہ کر انجانے میں مجھے یکا یک مغموم بنا دیا تھا۔ میں نے دھیرے سے کہا۔

''پارو اب گھر ہی کون سا ہے؟ اماں تمہارے سامنے ہی چل بسی تھیں، بابو جی رکشا کی شادی بھی اپنے ہاتھوں نہ کر سکے۔ بہنیں اب کہاں آئیں اور کیسے اکٹھی ہوں؟ میں نے شادی ہی نہیں کی جو گھر بستا اپنے کام یا شوق کے سلسلے میں جگہ جگہ گھومتا پھرتا ہوں، ایک طرح کا خانہ بدوش ہوں۔ پاؤں کا یہ چکر بھی اسی وقت تک چلے گا جب تک جسم میں طاقت ہو گی۔ بہنوں سے ملنے کی ذمہ داری میں نے خود اپنے کندھوں پر لے لی ہے۔ جب جی چاہتا ہے ان کے پاس ہو آتا ہوں۔ تم میری پانچویں بہن تھیں جس سے ابھی تک نہیں مل سکا تھا تو آج پرماتما نے یہ خواہش بھی پوری کر دی۔ زندگی رہی تو پھر آؤں گا۔ سب بہنوں کو تمہارا پتہ بھی بھیج دوں گا۔ وہ بڑی خوش ہوں گی اور یقیناً تمہیں خط لکھیں گی۔ پارو اس وسیع بیابان دنیا میں خط بھی بڑی غنیمت چیز ہے اس سے ہم سب کی ذہنی طور پر تو ملاقات ہو ہی جاتی ہے۔ شاید کوئی موقع ایسا بھی آ جائے جب سب بہنیں، تم بھی اور میں بھی پھر اکٹھے ہوں ہم سب پھر آدھی رات تک باتیں کریں۔ کون جانتا ہے؟''

کہنے کو تو میں نے یہ بات کہہ دی مگر بیتے ہوئے دنوں کو کون پکار کر واپس بلا

سکتا ہے؟ پارو کو جب یہ پتہ لگا کہ میں نہ صرف تنہا بلکہ بھٹکا ہوا آدمی ہوں تو وہ بڑی اُداس ہوگئی۔ اُسے شاید اس بات پر اتنا ہی دکھ ہوا ہوگا جتنا کہ میری چاروں بہنوں کو تھا۔ وہ کچھ دیر چپ رہی مگر پھر اس نے پوچھ ہی لیا۔

''بھیا آپ تو شادی کے بڑے حق میں تھے اور ہماری سب کی جلدی جلدی شادی بھی آپ ہی کرانا چاہتے تھے تو آپ نے خود اپنا بیاہ کیوں نہیں کرایا؟ آپ نے تو کبھی نہیں کہا تھا کہ میں شادی نہیں کروں گا۔ یہ بات تو میں کہتی تھی یا رکشا۔''

میں مسکرا دیا اور بولا۔

''میرے اس فیصلے کے پیچھے کوئی بات، کوئی حادثہ یا کوئی راز نہیں ہے۔ میرا خیال ہے کہ میں ہر طور پر بہت خوش ہوں۔''

یہ کہہ کر میں نے ہنسنے کی کوشش کی لیکن پارو اور شنکر اسی طرح چپ چاپ کھڑے تھے۔ پارو سنجیدہ بھی تھی اور اداس بھی جیسے اُسے میری زندگی میں مسرتوں کا یقین نہ ہو۔ جیسے وہ جانتی تھی کہ ایک آباد گھر کون سی جنت ہوتا ہے اور میں نے زندگی میں کیا کھو دیا تھا۔

تیسرے پہر پارو، شنکر اور بچّے مجھے چھوڑنے کے لیے بلرام پور جانے والی سڑک پر آئے جہاں سے یکّے ملتے تھے۔ موسم پھر سہانا ہو گیا تھا اور آسمان کی چھتری تلے، جس پر اودے اور مٹیالے بادلوں کے اَن گنت جوڑ لگے ہوئے تھے، بڑی خوشگوار ہوا چل رہی تھی۔ یکّے والا بھی کھڑا تھا جب یکّہ چلنے لگا تو پارو کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور میں بھی ضبط نہ کر سکا۔

گھوڑا تیزی سے بلرام پور کی سڑک پر بھاگا جا رہا تھا۔ پارو، شنکر اور بچّوں کے دھندلے ہوتے ہوئے چہرے اب اوجھل ہی ہونے والے تھے۔ سڑک، درخت، حتّیٰ کہ آسمان بھی، پیچھے کی طرف بھاگ رہے تھے۔ گویا لمحے گزر رہے تھے اور وقت پنکھ لگا کر اُڑ رہا تھا۔

آندھی

محبوب نگر دہلی اور ممبئی جتنا تو نہیں مگر گجرات کا ایک کافی بڑا شہر تھا۔ میلوں تک پھیلا ہوا اور دس پندرہ لاکھ کی ٹھوس اور ٹھکی ہوئی آبادی۔ یہ کارخانوں اور ملوں کا شہر تھا اور ایک تجارتی مرکز بھی یہاں امیر اور بے حد امیر لوگوں کی تعداد بہت زیادہ تھی مگر ہندوستان کے کسی بھی شہر کی مانند بڑی اکثریت غریب لوگوں کی ہی تھی۔ مکھیوں کی طرح بھنبھناتی نادار اور مفلس انسانی مخلوق کی لمبی چوڑی گندی بستیاں اور جھونپڑپٹیاں جگہ جگہ آباد تھیں۔ یہ چھوٹے بڑے گناہوں اور جرائم کے اڈے بھی تھے اور یہاں دن رات جو سرگرمی دیکھنے میں آتی تھی وہ پراسرار ہونے کے علاوہ بڑی تیز اور جاندار ہوتی تھی اور بہت سے امیر لوگوں سے براہِ راست جڑی ہوئی تھی۔

محبوب نگر اور دہلی اور ممبئی کی زندگی میں صرف یہ فرق تھا کہ جہاں دہلی اور ممبئی میں ہر وقت اس زندگی کی نمایاں اور طاقتور جھلکی اپنے تمام تر پہلوؤں کے ساتھ دیکھنے کو ملتی تھی جسے ہم 'ہائی لائف' سے تعبیر کرتے ہیں، وہاں محبوب نگر میں یہ زندگی دن کے وقت مقابلتاً ڈھکی چھپی رہتی تھی مگر شام ہوتے ہی اچانک اچھل کر بازاروں، ہوٹلوں اور کلبوں پر چھا جاتی تھی۔ اس 'ہائی لائف' یا مغرب زدہ تہذیب کے شناختی نشان تھے، ڈنر اور فلور ڈانس، جس میں بیوی کا پارٹنر ہونا لازمی نہیں تھا اور عورتوں کی سگرٹ اور شراب نوشی کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا جاتا تھا، پاپ میوزک، فیشن شوز، حسن کے مقابلے اور دوسرے اسٹیج شوز جن میں نوجوان ماڈل لڑکیاں حصہ لیتیں۔ ان تفریح گاہوں اور پروگراموں میں عورت کا وجود ایک

تیز مغلوب کن خوشبو کی طرح چھایا رہتا تھا۔

دہلی، ممبئی اور محبوب نگر کی کیا بات، ہماری تہذیب اور تمدن کو اکھیڑنے والی یہ مسموم ہوا ملک کے طول و عرض میں چل رہی تھی اور چھتوں اور کھڑکیوں میں سے ہوتی ہوئی ہمارے گھروں میں گھس گئی تھی۔ اب اندر گھس گئی تو باہر نکلنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کون اپنا ٹیلی ویژن باہر اٹھا کر پھینکے گا؟ کل کے بے ضرر خبر رساں روزنامے کو کون بند کرے گا؟ کیا زمانہ واقعی قیامت کی چال چل گیا تھا؟

محبوب نگر کے بیچوں بیچ ایک محلہ مومن پورہ تھا جس میں کبھی تو سارے مکان مسلمانوں کے تھے مگر اب ملی جلی آبادی تھی۔ اس میں متوسط طبقے کے ملازمت پیشہ لوگ رہتے تھے یا وہ جن کی چھوٹی موٹی دکان تھی یا کوئی اور کام کرتے تھے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں میں مکمل بھائی چارہ تھا اور عورتیں بھی ایک دوسرے کے یہاں آتی جاتی تھیں۔ اس محلے کی تین لڑکیاں سعدیہ، کسم اور لتا ایک دوسرے کی پکی سہیلیاں تھیں۔ یہ تینوں مانک لال ڈگری کالج میں بی۔ اے فائنل ایر کی طالبات تھیں۔ کند ہم جنس با ہم جنس پرواز کا مقولہ ان تینوں پر کچھ زیادہ ہی عائد ہوتا تھا۔ ایک ہی محلے، ایک ہی گلی، ایک ہی کالج اور ایک ہی کلاس کی یہ لڑکیاں بلا کی حسین تھیں اور تینوں اکہرے جسم کی، انیس بیس سال کی، ایک ہی قد کی بلند قامت لڑکیاں تھیں۔ چال بھی تقریباً ایک سی اور بال بھی سیاہ، لمبے اور گھنے۔ اگر تینوں ساتھ ساتھ چلتی ہوتیں تو پیچھے سے یہ جاننا تقریباً ناممکن ہوتا کہ کون کون تھی اور کالج کے لڑکوں اور لڑکیوں کو قدم بڑھا کر اور انہیں عبور کر کے پیچھے مڑ کر دیکھنا پڑتا تھا۔ اگر چہ ان کے لباس اور لباسوں کے رنگ مختلف ہوتے تھے۔

تینوں کے چہرے اتنے حسین اور کتابی تھے کہ دیکھنے والا دیکھتا رہ جاتا، تین مختلف تازہ کھلے ہوئے مہکتے پھول، صرف اس فرق کے ساتھ کہ لتا ہلکے سانولے رنگ کی، کسم گوری اور سعدیہ بہت گوری تھی۔ تینوں بات کرتی ہوئیں بار بار مسکراتی تھیں جس سے ان کے چہروں کی کشش اور بڑھ جاتی تھی۔ کالج کے بہت سے لڑکوں کا خیال تھا کہ اب تک جو ہندوستانی لڑکیاں مس یونی ورس اور مس ورلڈ بنی تھیں وہ تو ان کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں تھیں اور یہ کہ اگر ان میں سے کوئی ایسے مقابلۂ حسن میں حصہ لے تو اس کی کامیابی یقینی تھی۔

مگر سعدیہ، کسم اور لتا تو اوسط، قدامت پسند ہندوستانی گھرانوں کی وہ لڑکیاں

تھیں جن پر گھر والوں کو ناز ہوتا ہے۔ جو معصومیت، شرافت اور وفا کا پیکر ہوتی ہیں، جو اپنے والدین اور دوسرے بزرگوں کے سایۂ عاطفت میں پلتی ہیں، جنہیں گھر کی اینٹ اینٹ سے پیار ہوتا ہے۔ جن کی بے لوث محبت کا محور ان کے بھائی بہن ہوتے ہیں اور جن کی ساری کائنات گھر آنگن تک سمٹی رہتی ہے۔ جہانتک جسمانی کشش اور حسن کا تعلق ہے تو اس دیش کے ہر شہر اور گاؤں بلکہ ہر گلی اور محلے میں ایسی ان گنت نوجوان لڑکیاں ہوں گی جو کسی بھی ماڈل اور ملکہ حسن کو شرمندہ کر سکتی ہیں مگر سوال سامنے آنے کا تھا، کھلنے کھلانے کا تھا، بے حجابی کا اور عورت کے تقدس اور مرتبے کو کھو کر ایک ایسی شے بننے کا تھا جس کی قیمت کو کھلے عام آنکا اور طے کیا جاتا تھا۔

سعدیہ محبوب نگر کے واحد یونانی طب کے حکیم تاج الدین کی لڑکی تھی۔ مومن پورہ سے بازار میں ہی تاج الدین کے والد کا قائم کردہ یہ دواخانہ جوان کے زمانے میں بیحد چلتا تھا، اب اس نئے دور میں مریضوں کی بھیڑ سے نا آشنا ہو چکا تھا اب اس سے صرف اتنی آمدنی تھی کہ پرانے مددگار ملازم کی تنخواہ نکل آئے اور گھر کے اخراجات پورے ہو جائیں۔ تاج الدین نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ اپنے دونوں بیٹوں، سراج اور الطاف کو، جو سعدیہ سے چھوٹے تھے اور دسویں اور نویں میں پڑھ رہے تھے اس پیشے میں نہیں ڈالیں گے اور اعلیٰ تعلیم دلوا کر کچھ اور کروائیں گے۔ نئے حالات کے پیش نظر انہوں نے گھر میں آنے والے گجراتی اخبار کو بند کر کے انگریزی کا ایک مشہور روزنامہ بندھوالیا تھا۔ تا کہ تینوں بچوں کو انگریزی پڑھنے کا شوق ہو اور ان کی لیاقت بڑھے۔ اگر چہ گھر میں کلر ٹی۔ وی موجود تھا مگر وہ اس پر کیبل نہیں لگوانا چاہتے تھے۔ لیکن جب مومن پورہ کے پچاس فی صدی گھروں میں کیبل لگ گیا اور کسم اور لتا کے یہاں بھی لگ گیا تو وہ بھی اپنے بچوں کی اور اپنی بیوی کی اس خواہش کی مزاحمت نہ کر سکے اور کیبل لگوا لیا۔

کسم کے پتا راما سولکر ایک سرکاری دفتر میں ملازم تھے اور اچھی تنخواہ پاتے تھے۔ کسم ان کی اکلوتی لڑکی تھی۔ اس کا بڑا بھائی شیام، جس کی ابھی شادی نہیں ہوئی تھی، مرچنٹ نیوی میں شامل ہو گیا تھا اور ہانگ کانگ میں ٹریننگ لے رہا تھا۔ کسم اپنے رکھ رکھاؤ کا بڑا دھیان رکھتی تھی۔ اس کے پاس عمدہ لباسوں اور ساڑیوں کی کوئی کمی نہیں تھی۔ گھر میں چوں کہ ماں سارا کام خود کر لیتی تھی اور کسم صرف کبھی کبھی ہاتھ بٹا دیتی تھی۔ اس

لیے جب وہ گھر پر ہوتی تو اس کا سارا وقت ٹی۔وی کے مختلف چینلوں پر سیریل دیکھنے، ایم ٹی وی پر میوزک سننے اور فیشن اور بیوٹی شوز دیکھنے میں گزر جاتا۔ وہ ان پروگراموں میں حصہ لینے والے خوبرو نوجوان لڑکوں اور پریوں کی طرح حسین لڑکیوں سے بڑی متاثر ہوتی۔ وہ کسی سے نہ کہتی مگر اس کے ذہن میں کچھ نئے سپنے پل رہے تھے اور آنکھوں میں کچھ انجانی خواہشات کی چمک پیدا ہو گئی تھی۔

لتا کے پتا گوپال دھر کمرشل کالج میں کامرس کے لیکچرار تھے۔ لتا سے چھ سال چھوٹی ایک اور بہن تھی جو نویں جماعت میں پڑھتی تھی۔ گھر میں بوڑھی دادی اور بابا بھی تھے۔ سارے کا سارا گھر سادگی اور روایت پسند تھا۔ لتا کو شاید اپنی بے پناہ خوبصورتی کا احساس بھی نہیں تھا۔ وہ اپنی پڑھائی کی طرف پورا دھیان دیتی تھی۔ اگر چہ وہ ٹی۔وی پر آنے والے سیریل اور دوسرے پروگرام دیکھتی تھی مگر جب رات کو لیٹتی تو کئی پروگراموں کے بارے میں سوچ سوچ کر مغموم ہو جاتی۔ ٹی۔وی چوں کہ گھر میں مفت کا سنیما گھر تھا اس کا استعمال تو تعلیم پھیلانے، خبریں مہیا کرنے اور تعمیری کلچرل پروگراموں کو پیش کرنے کے لیے ہونا چاہیے تھا مگر یہ کیا ہو رہا تھا۔

تینوں لڑکیوں کے والدین ان کی غیر معمولی خوبصورتی اور عمدہ اُٹھان کی وجہ سے اور کچھ ان کے اعتقادات کی بنا پر اُن کے بی۔اے کرنے کے بعد جلد ہی اُن کی شادی کرنے کے حق میں تھے۔ ایک وجہ اور یہ بھی تھی کہ جس کالج میں وہ اب پڑھ رہی تھیں وہ بی۔اے تک ہی تھا مگر ایم۔اے تک کے دونوں کالج بہت دور تھے اور ان میں زیادہ تر امیر گھروں کے لڑکے پڑھتے تھے۔ یہ لڑکے اپنی کاروں میں آتے تھے اور پڑھائی کے مقابلے میں لڑکیوں کے ساتھ چھیڑ خانی بلکہ انہیں اپنے جال میں پھنسانے میں زیادہ وقت صرف کرتے تھے۔ دونوں کالجوں میں کچھ ایسی وارداتیں بھی ہو چکی تھیں جن کا چرچا کافی دنوں تک مقامی اخبارات میں کیا جاتا رہا۔

سعدیہ، کسم اور لتا نے بی۔اے فائنل کا امتحان دے دیا اور گھر بیٹھ گئیں۔ عموماً یونیورسٹی ڈیڑھ دو مہینے بعد نتیجے نکال دیتی تھی۔ والدین نے اطمینان کا سانس لیا۔ اب آنا جانا گلی تک یا بازار تک محدود ہو گیا۔ مگر تینوں سہیلیوں میں اتنی گاڑھی چھنتی تھی کہ وہ ہر روز ہی ایک دوسرے کے یہاں اکٹھی ہو جاتیں۔ گھنٹوں دنیا جہاں کی باتیں

کرتیں۔ کھاتی پیتیں اور ٹی۔ وی دیکھتیں۔ کسم گجراتی اور انگریزی کے کچھ فلمی رسالے بھی لیتی تھی اور اب چوں کہ وقت ہی وقت تھا، سعدیہ اور لتا بھی یہ رسالے اس سے لے کر پڑھنے کے لیے گھر لے آتیں۔

جب یہ تینوں کالج میں تھیں تو ان کی خوبصورتی کے چرچے دوسرے کالجوں میں بھی ہوتے تھے۔ شاید حسن میں مشک کی تاثیر بھی ہوتی ہے۔ اُن کا کالج کے احاطے میں عموماً ایک ساتھ پھرنا بھی اس کے لیے ذمے دار تھا کیونکہ جہاں یہ عمل انہیں احساس تحفظ عطا کرتا تھا وہاں اتنے ہوشربا نسوانی حسن کو سہ آتشہ بھی بنا دیتا تھا۔ گورنمنٹ کالج میں ایک لڑکا جاوید تھا۔ جب اس نے مانک لال ڈگری کالج کی ان لڑکیوں کے بارے میں سنا تو انہیں دیکھنے کے لیے بے تاب ہو گیا اور ان کے کالج میں کئی دفعہ گیا اور جب اس کی نظر ان پر پڑ گئی تو اس کے ہوش اڑ گئے۔ پھر اُس نے مانک لال کالج کے کچھ لڑکوں کی مدد سے ان کے نام پتا کیے اور کس محلے اور گلی کی لڑکیاں ہیں یہ بھی معلوم کر لیا۔

جاوید محبوب نگر کے کافی رئیس اور حسن ملز کے مالک کرامت علی کا بگڑا ہوا لڑکا تھا۔ عمر چوبیس پچیس کی ہوگی۔ دیکھنے میں نہایت خوبرو اور قد چھ فٹ سے بھی نکلتا ہوا۔ گورنمنٹ کالج میں داخلہ تو مل گیا تھا مگر بی۔ اے فائنل میں دو سال بیٹھنے کے باوجود پاس نہیں ہوا تھا اور اب کالج کا طالب علم بھی نہیں تھا مگر کالج ہر روز آتا تھا اور سب کو یہ کہہ دیتا تھا کہ وہ ایم۔ اے کا سٹوڈنٹ تھا۔ اس نے ہر کالج میں دوست بنا رکھے تھے اور اپنی چمچماتی نئی کار میں ایک کالج سے دوسرے کالج کے چکر لگاتا رہتا تھا۔ یا کسی شاندار ہوٹل میں دوستوں کے ساتھ بیٹھ کر کھاتا پیتا رہتا تھا۔ وہ ہر وقت جیب میں سینکڑوں روپے رکھتا تھا۔ اس کا ایک دوست تھا رام لکھن جسے وہ ہر وقت اپنی کار میں لیے پھرتا تھا۔ رام لکھن نے جاوید کو سگرٹ اور شراب نوشی کی طرف بھی راغب کر لیا تھا۔ جاوید کئی لڑکیوں کو دھوکا دے چکا تھا۔

جب جاوید کو پتہ لگا کہ سعدیہ، کسم اور لتا بی۔ اے فائنل کا امتحان دے کر گھر بیٹھ گئی ہیں اور ان کا ارادہ ایم۔ اے میں داخلہ لینے کا نہیں تھا تو اسے ایک عظیم نقصان کا احساس ہوا۔ وہ فرداً فرداً ان سے ایک دو بار راستے میں مل بھی چکا تھا۔ مگر وہ کسی زیادہ امید افزا موقعے کی تلاش میں تھا۔ وہ پریشان سا ہو کر ایک روز رام لکھن سے بولا۔

''یار میں نے اپنی غفلت سے ان لڑکیوں کو کھو دیا۔ ان کو پانے کے لیے میں

ہزاروں روپے خرچ کر سکتا ہوں۔ خاص طور پر سعدیہ نے تو مجھے دیوانہ بنا دیا ہے۔ تیری نظر میں ہے کوئی ترکیب؟''

''ہے اور تینوں لڑکیاں تجھے مل بھی جائیں گی۔ مگر مجھے اور تجھے جیل کی سزا کاٹنی ہوگی۔ ایک کام کر تو کسم اور لتا کو بھول جا اور سعدیہ سے شادی کر لے۔''

''ابے وہ تو ایک معمولی حکیم کی لڑکی ہے۔ ابا ہرگز نہیں مانیں گے۔''

''منا لے۔ غریب ہوئی تو کیا ہے تو تیرے مذہب کی۔''

جاوید کچھ ٹپٹا سا گیا۔ اُسے پہلی بار اپنی بے چارگی کا احساس ہوا۔

بی۔ اے فائنل کے ریزلٹ آ گئے اور سعدیہ، کسم اور لتا اچھے نمبروں سے پاس ہو گئیں۔ ان کے ایک دو دن پھر گہما گہمی میں گزرے اور یہ اپنے کالج بھی کئی دفعہ گئیں مگر پھر اپنے گھر کی چار دیواری میں سمٹ گئیں۔ ایک روز صبح دس بجے کُسم کا فون سعدیہ کو آیا کہ اس کی ممی شام تک کے لیے کہیں گئی ہیں اور وہ لتا کو لے کر اس کے گھر چلی آئے۔ لتا کے گھر میں فون نہیں تھا۔ سعدیہ نے اپنی امی کی اجازت لی اور نکل پڑی۔ لتا کو لیتی ہوئی وہ رکشا میں کسم کے گھر پہنچ گئی۔ تینوں ڈرائنگ روم میں بیٹھ گئیں۔ کسم نے فرج کھولا اور تین کوک لے آئی۔ چند منٹ ادھر ادھر کی بات کرنے کے بعد کسم نے ٹی۔ وی آن کر کے ایم ٹی۔ وی لگا دیا اور سب ادھر متوجہ ہو گئیں۔ ہندوستانی پاپ میوزک چل رہا تھا اور پس منظر میں اپنے ہی ملک کی لڑکیاں نیم عریاں لباسوں میں نوجوان لڑکوں کے ساتھ گانوں کے بولوں کی اپنی واہیات حرکتوں سے عملی وضاحت کر رہی تھیں۔ یہ ختم ہوا تو کسم نے ریموٹ سے چینل بدل دیا۔ یہ اپنا دوردرشن تھا مگر یہاں بھی اس وقت کوئی فیشن شو دکھایا جا رہا تھا اور بہت سی ماڈل لڑکیاں قطار در قطار ایک بڑی حاضری کے سامنے سے گزر کر موسمِ گرما کے نئے ڈیزائن کردہ نسوانی لباسوں کی نمائش اور اس سے زیادہ اپنے اعضا کی نمائش کر رہی تھیں۔ حاضرین میں بہت بڑی اکثریت مردوں کی تھی جیسا کہ ہمیشہ ہوتا ہے۔ جب یہ ماڈل لڑکیاں نئے ڈیزائن کے زیادہ مختصر تیراکی لباس میں اِٹھلاتی ہوئی سامنے آئیں تو سعدیہ سے نہ رہا گیا اور وہ بول پڑی۔

''اوئی اللہ! اتنی بے شرمی۔ کسم بند کر اس پروگرام کو۔ یہ ہمارے ملک کی لڑکیاں ہیں، مجھے تو سوچ کر ہی گھن آتی ہے۔ جانتی ہے تو ایک روز میں نے اپنی شلوار دھو کر آنگن

میں پلنگ پرٹانگ دی تو میری امی نے مجھے ڈانٹا اور کہا کہ جا اوپر چھت پر ڈال کر آ۔عورتوں کے کپڑے یوں کھلے عام نہیں سکھایا کرتے۔ میں نے آج تک اندرونی زنانہ کپڑے گھر میں ادھر ادھر پڑے ہوئے بھی نہیں دیکھے۔اور یہ لڑکیاں ان ہی دو کپڑوں کو پہن کر مردوں کی بھیڑ کے سامنے بے شرمی سے گھوم رہی ہیں؟''

کسم نے ٹی۔وی تو بند کر دیا مگر سعدیہ کی طرف حیرانی سے دیکھا۔کمرے کے ماحول نے ایک کروٹ سی لے لی تھی اور لتا بھی چونک سی پڑی تھی۔

''سعدیہ تو کس زمانے کی بات کر رہی ہے؟ نئے زمانے کے ساتھ چلنا سیکھ ورنہ ساری عمر کسی معمولی آدمی کے پلّے بندھ کر چولہا جھونکتے گزرے گی۔ یہ ترقی کا نیا زمانہ ہے۔لوگ کہیں کے کہیں پہنچ کر عیش و عشرت کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ میں تو خود ماڈلنگ کا کورس کرنے کی سوچ رہی ہوں۔ٹی۔وی سیریز میں بھی اگر موقعہ مل گیا تو پارٹ کرونگی۔بڑا پیسہ ہے اس لائن میں۔'' کسم بڑے جوش میں بولتی چلی گئی۔

''ہوگا'' سعدیہ نے کہا ''مگر مجھ سے تو آج کل کے سیریل بھی برداشت نہیں ہوتے۔مردوں کے ساتھ عورتوں کو بھی سگرٹ اور شراب پیتے دکھایا جاتا ہے۔جرم اور گناہ کی گھناؤنی زندگی پیش کی جاتی ہے اور اس کے لیے کوئی سنسر شپ نہیں ہے۔''

''میں تجھ سے اتفاق کرتی ہوں'' لتا بولی ''مگر شاید سماجی سطح پر ہم عورتیں لاچار ہیں اور ہم صرف اس قابل ہیں کہ انفرادی طور پر اپنے آپ کو بچانا چاہیں تو بچا لیں۔دیکھ کاروباری نظام، چاہے وہ عام کاروبار ہو فلمیں بنانے اور ٹی۔وی کے پروگراموں کا، مردوں کے ہی ہاتھ میں ہے۔فیشن شوز اور حسن کے مقابلے بھی تو مرد ہی کراتے ہیں۔میری اماں بتاتی تھیں کہ آزادی کے بعد اور ابھی بیس سال پہلے تک عورتوں کی کئی منڈلیاں اور جماعتیں سنیما ہال کے باہر لگے قابلِ اعتراض پوسٹروں تک کو عورت کا اپمان سمجھتی تھیں اور پوسٹروں کو پھاڑ کر پکٹنگ کرتی تھیں۔اور اب یہ دن رات کے ہونے والے زندہ شوز اخباروں اور رسائل میں چھپنے والی فوٹو۔کہاں گئیں وہ عورتیں اب؟''

اِس کے بعد تینوں لڑکیاں ضرورت سے زیادہ سنجیدہ ہو گئیں اور سعدیہ اور لتا گھر جانے کے لیے اٹھ گئیں۔

ایک دو مہینے بعد ہی حکیم تاج الدین سعدیہ کے لیے ایک مناسب لڑکا

ڈھونڈنے میں کامیاب ہو گئے۔ اس کا نام علیم اختر تھا اور وہ بڑودہ یونیورسٹی سے سول انجینئرنگ کی ڈگری حاصل کر کے ایک سال سے احمد آباد کی کسی بڑی کمپنی میں کام کر رہا تھا۔ علیم اختر کے والد یہیں میونسپل ہائی اسکول میں ہیڈ کلرک تھے اور نہایت شریف آدمی تھے۔ وہ تاج الدین کے مطب میں آتے رہتے تھے۔ ایک روز جب تاج نے ان سے ذکر کیا کہ میری خوبصورت، امورِ خانہ داری میں ہوشیار، اور مذہبی امور کی پابند بی۔ اے پاس لڑکی کے لیے کوئی لڑکا آپ کی نظر میں ہو تو تجویز فرمائیں۔ تو انہوں نے خود اپنے لڑکے علیم اختر کو تجویز کر دیا۔ انہوں نے صرف ایک شرط رکھی کہ جب گھر کی مستورات لڑکی کو دیکھنے آئیں گی تو لڑکا بھی ان کے ساتھ آئے گا۔ اور وہ بھی لڑکی کو دیکھ لے گا۔ انہوں نے یقین دلایا کہ اگر لڑکی اُن کے بیان کے مطابق ہوئی تو ان کی طرف سے ناہرگز نہیں ہوگی۔ علیم اختر اگلے ماہ گھر آ رہا تھا۔

جب شام کو گھر پہنچ کر تاج الدین نے سعدیہ کی امی کو یہ ساری بات سنائی تو وہ بولیں۔

''ٹھیک ہے دیکھ لے لڑکا۔ اب تو یہ رواج ہی ہو گیا ہے۔ لیکن اگر وہ یہ چاہیں گے کہ لڑکا لڑکی سے اکیلے میں بات کر لے یا کہیں باہر لے جائے تو یہ ہرگز نہیں ہوگا۔ مگر اب میری بھی سنیے جو خوشخبری میں آپ کو دے رہی ہوں۔ اس کے بارے میں تو آپ سوچ بھی نہیں سکتے۔ آج شہر کے رئیس اعظم کرامت علی صاحب کی طرف سے ان کے گھر کی دو عورتیں آئیں تھیں۔ انہوں نے اپنے نہایت حسین اور ایم۔ اے پاس لڑکے جاوید کے لیے اپنی سعدیہ کا ہاتھ مانگا ہے۔ اب اس رشتے کے مقابلے میں جو رشتہ آپ لائے ہیں وہ تو کچھ بھی نہیں۔''

''دیکھو'' تاج الدین بولے۔ ''شادی بیاہ کے رشتے برابری میں ہوتے ہیں۔ ہمارا ان کا کوئی مقابلہ نہیں۔ وہ لاکھوں کروڑوں کی جائداد کے مالک، نامی رئیس اور کہاں ہم گلیوں محلوں کے رہنے والے معمولی آدمی سوچ سمجھ سے کام لو۔ اگر یہ شادی طے بھی ہو جاتی ہے تو انگلیاں ہم پر ہی اٹھیں گی کہ لڑکی کا چکر لڑکے سے پہلے ہی سے چل رہا ہوگا۔ بدنام ہو جائیں گے سارے شہر میں۔''

''آپ نے نہ چھوڑے اپنے دقیانوسی خیالات'' سعدیہ کی امی تنک کر بولیں

''حسن بھی ایک طاقت اور دولت ہوتی ہے۔ بڑے بڑے تاجداروں نے اس کے آگے گھٹنے ٹیکے ہیں۔ نور جہاں اور شہزادہ سلیم کا قصہ تو آپ کو بھی یاد ہوگا۔ یہ پیغام اس لیے آیا ہے کہ ہماری بیٹی لاکھوں میں ایک ہے۔ کسی سے سنا ہوگا، پتہ کیا ہوگا تبھی کیا ہوگا ادھر ارادہ۔ لو میں بھی یہ بتا دوں کہ وہ یہ اشارہ بھی کر گئی ہیں کہ مہر کی رقم دس لاکھ سے کم نہیں ہوگی اور شادی کے کل اخراجات یعنی ہماری طرف کے بھی وہی کریں گے۔ اب اور کیا چاہیں گے آپ؟''

''کیسی بے تکی باتیں کر رہی ہو؟''

تاج الدین جھنجلا کر بولے ''گویا ہم اپنی عزت اور آبرو بیچ دیں؟ میں تو ایسی گری ہوئی بات سوچ بھی نہیں سکتا۔ دوسرے تم نہیں جانتیں میں نے سنا ہے کہ کرامت علی کے لڑکے اوّل درجے کے عیاش ہیں۔ مجھے اپنی بیٹی کی زندگی برباد نہیں کرتی۔ تم نے کہا کیا ان سے؟''

''میں کیا کہتی۔ کرامت علی صاحب کے گھر اور دفتر کا فون نمبر دے گئی ہیں کہ اگر رشتہ منظور ہو تو آپ انہیں فون کرلیں۔ کارڈ وہ رکھا ہے ٹیبل لیمپ کے پاس۔''

''میں تو فون نہیں کروں گا۔'' تاج الدین فیصلہ کن لہجے میں بولے ''بھول جاؤ اس تجویز کو۔''

''ایسے بڑھیا رشتے آپ کی قسمت میں ہیں بھی کہاں؟'' سعدیہ کی امی جل بھن کر بولیں اور رسوئی میں گھس گئیں۔

سعدیہ برابر کے کمرے میں دروازے سے لگی یہ سب باتیں سن رہی تھی۔ امی چوں کہ زور سے بول رہی تھیں۔ ان کی ساری باتیں تو اس نے سن لی تھیں مگر ابا کی صرف کوئی کوئی بات اس کے کان میں پڑی تھی۔ جہاں تک وہ سمجھ سکی تھی امی جاوید کے حق میں تھیں۔ مگر ابا کے ذہن میں کوئی انجینئر لڑکا تھا۔

وہ ایک گھریلو لڑکی تھی اور اپنی شادی کے بارے میں اپنے والدین کے سامنے منہ کھولنے کا وہ تصور بھی نہیں کرسکتی تھی۔ صبح بھی جاوید کے گھر سے دو عورتیں آئیں اور اس کے کان میں کچھ بھنک پڑی تو وہ اپنے کمرے میں دُبک کر بیٹھ گئی تھی۔ مگر جاوید کو تو وہ دیکھ چکی تھی، دوبار راہ چلتے اُس سے خفیف سی بات بھی ہوئی تھی۔ ایک نہایت حسین اور دولت مند لڑکے سے شادی کا ارمان کس لڑکی کے دل میں نہیں ہوگا...... اس روز سعدیہ نے نہ

چاہتے ہوئے بھی کئی بار جاوید کے بارے میں سوچا۔
کئی روز گزر گئے مگر تاج الدین نے جاوید کے والد کو فون نہیں کیا۔ ایک روز رام لکھن مطب پہنچ گیا۔ اس نے اپنا نام حشمت اور خود کو کرامت علی کا بھتیجا بتایا اور جاوید کی بات چھیڑ دی اور کہا کہ چچا جان آپ کے جواب کے منتظر ہیں۔ تاج الدین نے بڑی نرمی اور شائستگی سے صرف یہ جواب دیا کہ میرے فیصلے میں ابھی کافی وقت لگے گا۔ یہ کہہ تو دیا مگر خود بھی ڈانواں ڈول سے ہو گئے۔ ادھر دوسرے لڑکے علیم اختر کے احمد آباد سے آنے میں صرف کچھ دن رہ گئے تھے۔
آج جانے کیوں سعدیہ کچھ اداس سی تھی۔ ابا کے مطب جانے کے بعد وہ ممی سے پوچھ کر کسم اور لتا سے ملنے چلی گئی۔ پہلے وہ سیدھی کسم کے گھر گئی کیوں کہ اس کی باتیں بڑی مزیدار ہوتی تھیں چند منٹ کی خوش گپیوں کے بعد سعدیہ نے جاوید والی بات اسے بتادی۔ پہلے تو کسم چونکی مگر پھر بولی۔
''تو بڑی خوش قسمت ہے کہ جاوید جیسا امیر لڑکا تجھے مل رہا ہے۔ تیرے ابا پرانے خیالات کے معلوم ہوتے ہیں جو اس رشتے کی مخالفت کر رہے ہیں۔ تو کیوں نہیں بولتی؟ میں تو خود جاوید سے کئی بار ملی ہوں۔ کیا کشش ہے اس آدمی میں۔ میں تو اس سے دوستی کر لیتی مگر ڈر گئی کاش میں مسلمان ہوتی یا وہ ہندو ہوتا۔''
ابھی کسم نے یہ فقرہ کہا ہی تھا کہ دروازے کی گھنٹی بجی۔ کسم نے لپک کر دروازہ کھول دیا۔ یہ لتا تھی۔ اندر آتے ہی بولی۔
''کیا گپیں لگ رہی ہیں دونوں میں؟''
''مبارکباد دو سعدیہ کو'' کسم بولی۔
''اس کی شادی ہو رہی ہے اور وہ بھی رئیس زادے جاوید سے۔''
''جاوید سے؟'' لتا نے حیرانی سے پوچھا۔
''یہ سب اچانک کیسے ہو گیا۔ اس کا مطلب ہے تو اس سے ملا کرتی تھی اور تو نے ہم دونوں سے یہ بات دل میں چھپا کر رکھی تھی۔''
''نہیں، قسم خدا کی ایسا کچھ نہیں'' سعدیہ بولی ''اس کے گھر سے صرف پیغام آیا ہے۔ مگر ابو اس رشتے کے سخت خلاف ہیں کیوں کہ ہمارے اور ان کے مرتبے میں زمین

آسمان کا فرق ہے۔ ان کی نظر میں ایک اور انجینئر لڑکا ہے۔ شریف خاندان کا ہے اور احمد آباد میں ملازم ہے۔ ماں باپ یہیں ہیں اور ابو لڑکے کے والد کو اچھی طرح جانتے ہیں۔''

''اری تو پچھتائے گی'' کسم بولی پڑی۔ ''یہ خاندانی شرافت، اصول اور اخلاق کا مطلب ہے پچھڑنا اور کمزور رہنا۔ کرلے جاوید سے شادی اور عیش کی زندگی گزار۔''

''تو اپنی صلاح رہنے دے'' لتا نے کسم سے کہا ''تو آج کل کچھ زیادہ ہی ہوا میں اُڑ رہی ہے اور ہاں سعدیہ تو میری بات سن۔ دولت خود میں کوئی بری چیز نہیں۔ مگر اس کا بے جا استعمال بہت برا ہے۔ اولاد کے بگڑنے میں ماں باپ کا قصور ہوتا ہے۔ جاوید واقعی ایک خراب لڑکا ہے۔ اس نے مجھ پر بھی ڈورے ڈالنے کی کوشش کی تھی اور مجھے ایک خط بھی دیا تھا جسے میں نے پڑھتے ہی پھاڑ دیا تھا۔ میں نہیں جانتی مگر میرا خیال ہے کہ جاوید تیرے ساتھ کوئی چال چل رہا ہے۔ بات سچ بھی ہو تو بھی پوری طرح سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنا۔ جو آندھی اس وقت سارے ملک میں چل رہی ہے، اس میں ہم لڑکیوں کو ہی سب سے زیادہ خطرہ ہے۔ اپنے قدم جما کر رکھیو۔''

اس کے بعد سناٹا سا چھا گیا۔ جیسے سب کو سانپ سونگھ گیا ہو۔ پھر کسی کا جی نہ لگا اور چند منٹ بیٹھنے کے بعد ہی سعدیہ اور لتا گھر جانے کے لیے اُٹھ گئیں۔

جب سعدیہ گھر پہنچ کر اپنے کمرے میں داخل ہوگئی اور پلنگ پر ایک کتاب لے کر بیٹھ گئی تو اس کی امی آئیں اور بولیں۔

''تمہارے ابا کا فون آیا تھا کہ وہ احمد آباد والا لڑکا چھ تاریخ کو یعنی پانچ چھ دن بعد ہی یہاں آجائے گا اور سات تاریخ کو جمعے کے دن وہ سب ہمارے یہاں آنا چاہتے ہیں۔ تمہارے ابا نے خواہ مخواہ ضد پکڑ لی ہے ورنہ میں تو جاوید کے ہی حق میں ہوں۔ تم بھی تو کچھ منہ سے بولو تمہارے ابا کہتے ہیں کہ میں تمہاری رائے بھی لے لوں۔''

''امی میری رائے کے کیا معنی۔ آپ دونوں کا جو فیصلہ ہوگا وہ میرے بھلے میں ہی ہوگا۔ ابا حضور واقعی عظیم ہیں جو میری رائے بھی جاننا چاہتے ہیں۔ ان سے فقط اتنا کہہ دیجیے گا کہ مجھے دولت نہیں، شرافت، وفاداری اور قناعت عزیز ہیں۔''

اور یہ کہہ کر سعدیہ نے لیٹ کر کروٹ لے لی اور کتاب پڑھنے لگی۔

تنگ گلی

دلّی کی گلیوں کو تو ذوق کے ایک شعر نے شہرتِ دوام بخش دی ہے مگر مرادآباد کی گلیاں بھی دلی کی گلیوں سے کچھ کم نہیں ہیں۔ دراصل گلیاں تو ہمارے قدیم شہروں اور دیہات کے معاشرے اور تہذیب کا ایک اہم حصہ رہی ہیں۔ مرادآباد کے محلہ کٹھیراں میں ایک ایسی ہی سانپ کی طرح بل کھاتی ہوئی بلکہ کسی گاؤں کی پگڈنڈی کی طرح ٹیڑھی میڑھی گلی تھی جسے سب تنگ گلی کہا کرتے تھے۔ دراصل اس گلی کا نام گلی بنے میاں تھا مگر یہ اتنی تنگ تھی کہ تنگ گلی کے نام سے زیادہ مشہور ہوگئی تھی۔ میونسپل کمیٹی نے بھی گلی کے منہ پر کیلوں سے جڑے ہوئے ٹین کے اپنے پرانے بورڈ ''گلی بنے میاں'' کو ہٹا کر 'تنگ گلی' کا بورڈ لگا دیا تھا!

تنگ گلی اندر ہی اندر بل کھاتی ہوئی کوئی دو تین سو گز چلی گئی تھی اور پیچھے ایک اور چھوٹے سے بازار میں نکلتی تھی۔ اس پوری گلی میں مسلمانوں کے ہی گھر تھے۔ اس کے دونوں طرف زیادہ تر دو منزلہ پختہ یا نیم پختہ مکان تھے مگر کچھ مکانوں پر تیسری منزل بھی پڑ گئی تھی گلی اتنی تنگ تھی کہ دو آدمی بیک وقت ساتھ ساتھ مشکل سے چل سکتے تھے اور چونکہ گلی کے بیچوں بیچ ایک چھوٹی سی نالی بھی تھی اور آنا جانا دونوں طرف سے لگا رہتا تھا لوگ عموماً آگے پیچھے ہو کر چلتے رہتے تھے اونچے مکانوں کے سبب اور کیونکہ گلی ہر چند قدم کے بعد موڑ کھاتی تھی، سورج کی روشنی کہیں کہیں کسی کونے کھدرے سے نکل کر آنکھ مچولی سی کھیلتی رہتی تھی اور جلدی ہی اوپر دیواروں اور منڈیروں پر ٹنگ جاتی تھی۔ جاڑوں میں روشنی اور بھی کم رہتی اور برسات کے موسم میں تو گلی میں ملگجی سا اندھیرا ہر وقت چھایا رہتا۔ رات کو تو گلی

اندھیری بھی ہو جاتی اور سنسان بھی کیونکہ کمیٹی نے اپنے حساب سے ہر بیس گز کے فاصلے پر دیوار پر ایک مدھم سا بلب لٹکا رکھا تھا اور موڑوں کو نظر انداز کر دیا تھا۔ بلب بھی اکثر خراب رہتے۔ اس لیے جہاں رات ہوئی گلی میں آمدورفت کم ہو جاتی تھی اور لوگ عام طور پر بیٹری یا ٹارچ لے کر باہر نکلتے تھے۔ مستورات اول تو نکلتی نہیں تھیں لیکن ضرورت سے باہر جانا پڑتا تو گھر کا کوئی مرد ضرور ساتھ ہوتا۔

البتہ تنگ گلی کے سارے گھر اندر سے کشادہ اور کھلے آنگن والے تھے اور روشنی اور دھوپ کی کوئی کمی نہیں تھی۔ بجلی بھی تقریباً سب گھروں میں تھی۔ دن بھر گلی میں عورتوں کا آنا جانا بھی لگا رہتا تھا مگر برقعہ پہن کر نکلتیں اور بچ بچا کر چلتیں۔ یوں بھی مراد آباد میں پردے کا رواج کچھ زیادہ ہی تھا اور تیرہ چودہ سال کی اسکول جانے والی لڑکیاں بھی بُرقعے میں نکلتیں، اگرچہ یہ اور بات تھی کہ وہ سڑک پر یا بازار میں آتے ہی اپنا منہ کھول لیتیں۔

تنگ گلی میں چونکہ نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کی بہتات تھی اور اکثر مکانوں کی چھتیں ایک دوسرے سے ملی ہوئی تھیں، حسن و عشق کی داستانیں بھی پلتی رہتی تھیں۔ عموماً یہ داستانیں کسی خوش آئند نتیجے کے بغیر اپنے آپ ختم ہو جاتی تھیں کیونکہ یہ کمبخت گلی ملنے ملانے کے مواقع بہت کم فراہم کرتی تھی۔ مگر جذبۂ عشق قدرتی ہونے کے ساتھ ساتھ اتنا طاقتور ہوتا ہے کہ دھڑکتے دل اپنی راہیں اور موقعے ڈھونڈ ہی لیتے ہیں اور تنگ گلی کے ایک دو عشق تو اتنے والہانہ ہوئے کہ ان کا چرچا سارے مراد آباد میں کافی عرصے تک ہوتا رہا!

تنگ گلی کے کچھ لڑکے تو بڑے آفت کے پرکالے تھے۔ گلی کی برقعہ پوش لڑکی پر نظر ڈالتے ہی اور اس کی چال، ڈھال دیکھ کر ہی تاڑ جاتے کہ فلاں لڑکی ہے اس کی وجہ یہ تھی کہ ایک ہی گلی کے ہونے کے ناتے گیارہ بارہ سال تک کی لڑکی کو آتے جاتے دیکھا ہی ہوا ہوتا ہے۔ دوسرے آس پاس کے مکانوں میں رہنے والی لڑکیوں کے چہروں پر کبھی نہ کبھی تو نظر پڑ ہی جاتی تھی۔ اور لڑکے کسی جاتی ہوئی برقع پوش لڑکی کا اپنے دوستوں کے سامنے ایسا نقشہ کھینچ دیتے تھے کہ ان کی آنکھوں کے سامنے بھی اس لڑکی کا سراپا جھلملانے لگتا۔ نوجوانی کے ایام میں جب حسن و عشق کے جذبے سر اٹھاتے ہیں تو قوتِ بیان میں یوں بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔ ایسے ہی لڑکے بشرطیکہ وہ تعلیم سے بہرہ ور ہوں جلد یا بدیر کسی نہ کسی قسم کے شاعر یا افسانہ نگار بھی ہو جاتے ہیں!

تنگ گلی کے وسط میں دائیں جانب موڑ سے پانچویں ایک منزلہ نیم پختہ مکان میں جس کے بیرونی دروازے پر پیوند لگے ٹاٹ کا پردہ پڑا ہوا تھا، احمد علی گھڑی ساز رہتا تھا۔ بہت ہی شریف اور ایماندار آدمی تھا اور پاس ہی بازار میں منشی وجاہت حسین کی برتنوں کی دکان کے تھڑے پر کونے کی چھوٹی سی جگہ پر اپنی دکان کر رکھی تھی۔ گاہک تو کافی آتے تھے اور کام بھی بہت عمدہ کرتا تھا مگر چونکہ ایمانداری کو اپنا شعار بنا رکھا تھا صرف اتنی آمدنی تھی کہ گھر کا گزارہ آسانی سے چل جائے۔ اس کے دو لڑکیاں تھیں اور بیٹا کوئی نہیں تھا۔ بڑی لڑکی یاسمین نے پرائیویٹ امیدوار کے طور پر میٹرک پاس کر کے اردو کے ادیب فاضل کے امتحان کی تیاری شروع کر دی تھی۔ اس کے لیے وہ ادارۂ شرقیہ میں شام کو چھ بجے سے ساڑھے سات بجے تک پڑھنے جایا کرتی تھی۔ اُسے پڑھنے لکھنے کا بڑا شوق تھا اور اس نے اپنی ڈائری میں اردو کے سینکڑوں عمدہ شعر نوٹ کر رکھے تھے۔ دوسری لڑکی نکہت یاسمین کی پیدائش کے نو سال بعد ہوئی تھی اور اس سے بہت چھوٹی تھی۔ وہ ہری مسجد کے لڑکیوں کے اسکول میں پڑھنے جاتی تھی۔ احمد علی کے والدین بھی احمد علی کے ساتھ رہتے تھے۔

یاسمین اٹھارہ انیس سال کی بے حد خوبصورت لڑکی تھی۔ شاید تنگ گلی کی سب سے حسین لڑکی ہو۔ گول چہرہ اور جاذبِ نظر نقوش۔ کسی جھیل کی طرح پھیلی ہوئی گہری سیاہ آنکھیں۔ خوبصورت بھرپور ہونٹ اور موتیوں کی آب والے خوشنما دانت۔ رنگ خوشگوار گورا۔ مسکراتی تو آس پاس اجالا سا ہو جاتا۔ دن بھر گھر کے کام کاج میں لگی رہتی اور فالتو وقت میں کوئی کتاب یا رسالہ پڑھ لیتی۔ نکہت کو بھی اپنے ساتھ لگائے رکھتی اور اس کی پڑھائی میں بھی اس کی مدد کرتی۔ اس کی گلی میں اس کی دو سہیلیاں سلمہ اور ناز بھی تھیں۔ سلمہ بھی ادارۂ شرقیہ میں اُس کے ساتھ پڑھتی تھی۔ وہ جاتی تو الگ تھیں مگر لوٹتی اکٹھی تھیں۔

گلی کے نوجوان لڑکوں کو یہ تو پتہ تھا کہ احمد علی گھڑی ساز کی لڑکی بے حد حسین تھی لیکن کسی کی نظر اُس کے چہرے پر شاید نہیں پڑی تھی۔ وجہ وہی تھی کہ جب بارہ تیرہ سال کی ہو گئی تو باہر برقعہ اوڑھ کر نکلنے لگی تھی اور اس طرح وہ حسن جو چڑھتی جوانی میں شرربار ہو جاتا ہے، باہر والوں کی نظروں سے بچا رہا۔

ادارۂ شرقیہ مولوی کرامت اللہ کی پرانی درسگاہ تھی۔ یہ تنگ گلی سے باہر نکلتے ہی بازار میں بائیں ہاتھ پر ایک چوبارے میں تھی۔ مولوی صاحب تقریباً ۶۵ سال کے

بزرگ تھے اور اردو، فارسی اور عربی کے عالم تھے۔ ان کے گزر بسر کا ذریعہ اب یہی درسگاہ تھی۔ شام کے وقت وہ طلبا کو ادیب فاضل اور ادیب کامل کی تیاری کراتے تھے اور صبح کو چار پانچ لڑکے فارسی کے منشی فاصل کے امتحان کی تیاری کے لیے آجاتے تھے۔ فی طالب علم بیس روپے ماہوار فیس لیتے تھے۔ شام کے وقت طلبا کی تعداد بیس کے قریب تھی جس میں پانچ لڑکیاں بھی تھیں۔ مولوی صاحب نے کمرے میں بیٹھنے کا انتظام فرش پر کر رکھا تھا اور طلبا کے آگے چھوٹے چھوٹے لکڑی کے ڈیسک رکھے ہوئے تھے جن پر کتاب یا کاپی رکھی جاسکتی تھی۔ دری کے بیچوں بیچ ایک موٹا پردہ لگا رہتا تھا جو لڑکوں اور لڑکیوں کے درمیان دیوار کا کام دیتا تھا۔ مولوی صاحب اس طرح بیٹھتے کہ اپنے طلبا اور طالبات کو آسانی سے دیکھ سکیں اور ان سے مخاطب ہوسکیں۔ لڑکے دروازے کے پاس ان کے بائیں ہاتھ پر بیٹھتے اور لڑکیاں مولوی صاحب کے پیچھے سے ہوتی ہوئیں ان کے دائیں ہاتھ پر بیٹھ جاتیں۔ مولوی صاحب اتنے سخت مزاج تھے کہ کسی لڑکے کو نہ ہنسنے دیتے اور نہ فالتو بولنے دیتے۔ پڑھائی ختم ہوتی تو لڑکیوں کو پہلے چھوڑ دیتے اور پانچ دس منٹ تک لڑکوں کو روکے رکھتے۔ مگر لڑکوں کے لیے تو لڑکیوں کا ان کے بالمقابل اتنا قریب بیٹھنا ہی کہ ان کی آواز، دبی دبی ہنسی اور کھنکھار ان تک پہنچ جائے، ان کے جذبات کو اتھل پتھل کرنے کے لیے کافی تھا۔ شکل سے نہ سہی لڑکے لڑکیوں کے نام اور ان کی آواز سے واقف تھے کیونکہ مولوی صاحب ہر روز لڑکوں اور لڑکیوں کی حاضری ان کا نام لے کر لیتے تھے اور جواب میں سب کو ''حاضر جناب'' تو کہنا ہی پڑتا تھا!

تنگ گلی میں جو بھی لڑکی اپنے مکان سے نکلتی تو باہر قدم رکھتے ہی نقاب اپنے چہرے پر ڈال لیتی۔ ایک روز ایسا اتفاق ہوا کہ عین اس لمحے جب یاسمین نے ادارۂ شرقیہ جانے کے لیے دہلیز سے باہر قدم رکھا تو شوکت کو بالکل اپنے سامنے پایا جو خود بھی اپنی کتابیں ہاتھوں میں تھامے ادارۂ شرقیہ جا رہا تھا۔ دونوں کی نظریں ملیں مگر یاسمین نے فی الفور نقاب نیچے گرالی اور اپنے راستے پر ہولی۔ لیکن اس ایک لمحے میں ہی یاسمین کا پورا چہرہ اس کے سامنے بجلی کی طرح کوند گیا تھا اور اس کے قدم وہیں جم گئے تھے۔ یا اللہ کیا حسن تھا اور کیسی حیا تھی! شوکت کو ہوش سا نہ رہا اور وہ گلی کے آخر تک یاسمین کے پیچھے مناسب فاصلہ چھوڑ کر خیالات میں ڈوبا ہوا چلتا رہا۔ ادھر یاسمین کی نظریں بھی شوکت سے ملی تھیں تو اس

کے دل میں بھی ایک انجانا سا احساس پیدا ہوا تھا۔ اس کے قدموں میں اس خیال سے کہ وہ لڑکا اس کے پیچھے پیچھے آ رہا تھا، ایک ہلکی سی لغزش بھی تھی۔

شوکت کوئی بائیس سال کا حسین نوجوان تھا اور تنگ گلی کا ہی رہنے والا تھا۔ اس کے والد ماسٹر خدا بخش جوبلی ہائی اسکول میں ڈرائنگ کے ٹیچر تھے اور بہت شریف انسان تھے۔ شوکت بھی اچھا لڑکا تھا اور ہر ایک کے ساتھ بڑی تہذیب اور ادب سے پیش آتا تھا۔ اس میں کوئی بھی عیب نہیں تھا۔ اس نے جوبلی ہائی اسکول سے ہی اعلیٰ نمبروں سے میٹرک پاس کر کے ٹائپنگ کا کورس کرلیا تھا۔ اور کمیٹی کے دفتر میں ٹیسٹ کے بعد اسے کلرک کی ملازمت مل گئی تھی۔

دو سال کی ملازمت کے بعد اُسے مستقل کر دیا گیا تھا۔ اس کا ارادہ اردو میں ادیب فاضل کا امتحان پاس کرنے کے بعد پرائیویٹ طور پر بی۔ اے کرنے کا بھی تھا۔ وہ اپنی صحبت بھی اچھے لڑکوں سے رکھتا تھا۔

ایک روز دن میں خاصی بارش ہوگئی۔ تنگ گلی کہیں سے کچی تھی اور کہیں سے پکی۔ کچی جگہ پر سنبھل کر پاؤں رکھنا، پڑتا تھا۔ بیچ کی نالی بھی اتنی بھر گئی تھی کہ پانی اِدھر اُدھر پھیل گیا تھا۔ پونے چھ بجے شوکت اپنے گھر سے ادارۂ شرقیہ کے لیے نکلا۔ بارش تو اب بند تھی مگر فضاء میں بھیگا پن تھا اور گلی میں آمد و رفت بھی کم تھی۔ پہلا موڑ پار کرتے ہی اس نے دیکھا کہ یاسمین بھی چند قدم کے فاصلے پر جا رہی تھی۔ وہ ذرا تیز چل کر اس کے قریب پہنچ گیا۔ یاسمین دوسرے موڑ پر پہنچی ہی تھی کہ اس کی ایک کتاب نیچے کچی اور گیلی مٹی میں گرگئی۔ شوکت نے جو اس کے بالکل پیچھے تھا چشم زدن میں آگے بڑھ کر کتاب اٹھالی اور اسے اپنے رومال سے صاف کر کے یاسمین کو تھمادی جو خود کتاب اٹھانے کے لیے اس کی طرف مڑ گئی تھی۔

''آپ کا بہت بہت شکریہ'' یاسمین بولی ''مگر آپ نے اپنے رومال کو کیوں گندہ کرلیا۔ میں خود صاف کرلیتی۔''

''کتاب کیچڑ سے گندی ہوگئی تھی اور آپ کو ایسی حالت میں کتاب دینا میری جانب سے بے ادبی ہوتی۔ میرا نام شوکت ہے اور میں آپ ہی کی گلی میں رہتا ہوں۔''

''اس بندی کا نام یاسمین ہے۔ خدارا مجھے آپ کہہ کر شرمندہ نہ کریں۔ آپ مجھ

سے عمر میں بھی بڑے ہوں گے۔ اچھا میں چلتی ہوں۔ خدا حافظ۔''

اور یاسمین مڑ کر تیزی سے آگے بڑھ گئی۔ اگر چہ شوکت نے خدا حافظ سن کر خود بھی بے ساختہ خدا حافظ کہہ دیا تھا مگر وہ اس کی نوعیت کو نہیں سمجھا تھا کیونکہ اس وقت ان دونوں کی منزل ایک تھی اور صرف تین چار منٹ کے بعد ہی وہ ایک کمرے میں پھر پاس پاس بیٹھے ہوں گے۔ شاید پہلے نہیں تو آج اسے ضرور پتہ لگ گیا ہوگا کہ یہ وہی ادارۂ شرقیہ میں اس کے ساتھ پڑھنے والا شوکت تھا جس کا نام حاضری لیتے ہوئے مولوی صاحب پکارتے تھے۔ مگر وہ تو سارا اجنبی لڑکوں اور لڑکیوں کے مابین ایک آواز کا طلسم تھا۔ آج کی ملاقات کتنی بھی خفیف سہی، حقیقی زندگی کی ملاقات تھی اور خدا حافظ کے الفاظ کتنے موزوں تھے۔ مگر ان الفاظ میں جانے کون سا جادو تھا کہ اس کا اس روز پڑھائی میں جی نہیں لگا اور رات کو بھی جب وہ اپنے بستر پر سونے کے لیے لیٹا تو بار بار یہ الفاظ اس کے ذہن میں گونجتے رہے۔ اسے ان میں ایک اپنائیت کا احساس ہوا۔ وہ یہ بھی سوچتا رہا کہ یاسمین جتنی خوبصورت تھی، اتنی ہی دلکش اس کی آواز اور انداز گفتگو تھا۔

جہاں شوکت کے لیے یاسمین سے ملنا جلنا تنگ گلی میں ممکن تھا نہ باہر، وہاں اب ادارۂ شرقیہ میں ڈیڑھ گھنٹے کا وقت اچانک زیادہ خوشگوار ہو گیا تھا جب یاسمین پسِ پردہ اس کے بالمقابل بیٹھی رہتی تھی اگر چہ وہ ایک دوسرے کو نہ دیکھ سکتے تھے اور نہ بات چیت کا کوئی موقع تھا۔ لوٹتے ہوئے تو سلمہ بھی اس کے ساتھ ہوتی تھی اور جب وہ نیچے اترتا تھا تو وہ دونوں اپنے گھر پہنچ گئی ہوتی تھیں۔

ایک روز شوکت کو دفتر میں دیر ہو گئی تو وہ گھر آئے بغیر سیدھا ادارۂ شرقیہ پہنچ گیا اور مولوی صاحب کو سلام کر کے اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔ پڑھنے کا کام تو خیر ساتھ والے لڑکے کی کتاب کو تھوڑا سا اپنی طرف کھسکا کر ہو گیا مگر جب مولوی صاحب نے کچھ لکھوانا چاہا تو وہ آئیں بائیں جھانکنے لگا۔ جب مولوی صاحب نے اس کا نام لے کر قدرے سختی سے پوچھا کہ تمہاری کاپی کہاں ہے اور کاپی کتاب کے بغیر تم پڑھنے کیسے آئے ہو تو وہ کچھ بول نہ سکا۔ اتنے میں ہی ایک نسوانی ہاتھ پردے کے نیچے سے آگے بڑھا اور ایک مترنم آواز نے آہستہ سے کہا۔

''یہ کاپی لے لیجیے۔ میرے پاس فالتو ہے۔''

یہ یاسمین تھی۔ شوکت نے کاپی پکڑلی اور لڑکوں میں فوراً کھسر پھسر ہوئی اور لڑکیاں بھی دبی دبی آواز میں ہنسیں۔ مولوی صاحب۔ نے زور سے 'خاموش' کہہ کر سب کو چپ کرادیا اور لکھوانا شروع کر دیا۔ پڑھائی ختم ہوگئی اور لڑکے اور لڑکیاں گھر چلے گئے تو مولوی صاحب سوچنے لگے۔ بڑے جہاندیدہ تھے اور دنیا بھر کا تجربہ ان کی پتلیوں میں سمایا تھا۔ تاڑ گئے کہ دال میں کچھ کالا تھا۔ ایک روز مولوی صاحب یاسمین کی کاپی درست کر رہے تھے تو اس میں سے کاغذ کا ایک تہہ شدہ پرچہ نیچے گر پڑا۔ مولوی صاحب نے اُسے اٹھا کر کھولا اور پڑھا تو ان کا شبہ یقین میں بدل گیا۔ اس میں لکھا تھا۔

''اچھی یاسمین۔

یہ کتنی جان لیوا بات ہے کہ میں تم سے مل سکتا ہوں، نہ بات کر سکتا ہوں۔ اب اپنے دل کی بات کہوں تو کیسے۔ مجھے اپنی کاپی کل دے کر تم نے مجھ پر بڑا احسان کیا۔ یہ چھوٹا سا پرچہ دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر اسی کاپی میں رکھ رہا ہوں جو آج شام کو مولوی صاحب کے ذریعے تمہیں لوٹا دوں گا۔

یاسمین میں تمہیں دل و جان سے چاہتا ہوں اور ہر وقت تمہارے بارے میں سوچتا رہتا ہوں۔ تمہارے بغیر میں اب اپنی زندگی کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ میری محبت ایک پاکیزہ جذبہ ہے اور یہ کبھی کسی گراوٹ کا حامل نہیں ہوگا۔ میں نہیں جانتا کہ تم میرے بارے میں کیا سوچتی ہو۔

تمہارا

شوکت''

یہ پرچہ یاسمین نے پڑھ لیا تھا۔ کیونکہ اسی کے نیچے اس نے یہ لکھا ہوا تھا۔ ''یہ پرچہ آپ نے لکھ کر اچھا نہیں کیا۔ اگر کوئی دوسرا پڑھ لیتا تو ہماری بڑی بدنامی ہوتی اور میں کہیں کی نہ رہتی۔

''میں تو صرف اتنا کہہ سکتی ہوں کہ میں بھی آپ کو چاہتی ہوں اور میں بھی آپ کے بارے میں اکثر سوچتی ہوں۔ مگر اس پرچے کو آپ تک واپس پہنچانے کا نہ میرے پاس ذریعہ ہے اور نہ ہمّت۔ جذبات سے مغلوب ہو کر میں نے جواب تو لکھ دیا ہے مگر آپ کی

تحریر اور میرا جواب دو چار دن تو اسی کاپی میں سرورق کے اندر رہے گا اور جب اسے کئی بار پڑھ لوں گی تو ایک دن چپکے سے پھاڑ دوں گی۔"

مولوی صاحب نے سوچا کہ یاسمین شاید بھول گئی کہ یہ پرچہ بہت دن گزرنے کے بعد بھی اُس نے پھاڑا نہیں اور یہ کہ پرچہ اس کاپی میں ہے۔ انہوں نے پرچے کو تہہ کیا، شوکت کی کاپی اٹھائی اور کاپی کے آخری لکھے ہوئے صفحے پر اسے دبا کر رکھ دیا تا کہ دو محبت بھرے دلوں کا پیغام ایک دوسرے تک پہنچ تو سکے۔ مگر کچھ سوچ کر انہیں اپنی یہ حرکت بچگانہ نہیں تو ایک معلم کے طور پر نہایت غیر ذمے دارانہ بلکہ غیر اخلاقی لگی۔ انہوں نے وہ پرچہ پھاڑ کر پھینک دیا اور کام ختم کر کے سیدھے احمد علی گھڑی ساز کی دکان پر پہنچے۔ احمد علی سلام کر کے بولا۔ "آپ نے کیوں زحمت کی۔ مجھے بلوا لیا ہوتا۔"

"میں نے خود ہی آنا مناسب سمجھا" مولوی صاحب بولے "یاسمین اب ایک مہینے بعد ادیب فاضل کا امتحان دے دیگی اور انشاء اللہ پاس ہو جائے گی۔ اُس کے لیے ایک لڑکا میری نظر میں تھا۔ سوچا آپ کو بتا دوں۔"

"فرمایئے نا۔ میں تو خود اس کی شادی کے لیے فکر مند ہوں۔"

"ماسٹر خدا بخش کے لڑکے شوکت کے بارے میں سوچا تھا میں نے نہایت شریف لڑکا ہے اور کمیٹی میں پکی ملازمت میں ہے۔"

"شوکت تو بہت اچھا لڑکا ہے۔ اور ہماری ہی گلی کا ہے۔" احمد علی بولا "مگر میں تو ایک معمولی گھڑی ساز ہوں۔ کیا وہ یہ رشتہ منظور کر لیں گے؟"

"آپ کہیں تو میں ان سے بات کر کے دیکھ لیتا ہوں۔ آگے جو خدا کو منظور ہو۔"

"دیکھ لیجیے۔ میں بڑا ممنون ہوں گا۔"

مولوی کرامت اللہ شام کو چار بجے ماسٹر خدا بخش کے گھر پہنچ گئے۔ وہ بازار گئے ہوئے تھے مگر ان کا چھوٹا بھائی یعنی شوکت کا چچا رحیم بخش گھر پر تھا۔ مولوی صاحب نے اس سے ہی ذکر چھیڑ دیا تو وہ بولا۔

"مولوی صاحب ہمیں کسی اچھے کھاتے پیتے گھر کی لڑکی چاہیے چاہے کم پڑھی لکھی ہو۔ احمد علی تو معمولی گھڑی ساز ہے اور اس کا کام بھی زیادہ نہیں چلتا۔ اس میں ہماری حیثیت کے مطابق خرچ کرنے کی طاقت کہاں ہے؟"

''خدا سے ڈر کر بولو رحیم بخش۔ کسی کی غریبی کا مذاق اڑانا گناہ ہے۔ پیسہ تو آنی جانی شے ہے۔ اصل دولت تو انسان کی قناعت اور اخلاق ہے۔''

''مگر مولوی صاحب'' رحیم بخش بولا ''وہ جہیز دے گا کہاں سے؟ بارات کی خاطر تواضع بھی بڑے پیمانے پر ہوگی۔ ہمارے خاندان کی بھی کوئی عزت اور ساکھ ہے۔''

''مگر اسلام میں جہیز لینے اور دینے کی اجازت ہے کہاں؟ دوسروں کے دیکھا دیکھی اب مسلمان بھی جہیز کھلم کھلا مانگتے ہیں جو بڑے افسوس کی بات ہے۔ میاں جس نے بیٹی دے دی سب کچھ دے دیا۔ پھر غریب سے غریب باپ بھی اپنی بیٹی کو اپنی حیثیت سے بڑھ کر دیتا ہے۔ جہیز تو ایک لعنت ہے۔ بہر حال مرضی آپ کی ہے مگر یاسمین جیسی لڑکی آپ کو نہیں ملے گی۔''

اتنے میں ماسٹر خدا بخش آ گئے۔ رحیم بخش نے مولوی صاحب کے آنے کا مقصد بتا دیا۔ ماسٹر خدا بخش نے بھی مولوی صاحب کے آخری دو تین فقرے سن لیے تھے۔ وہ بیٹھتے ہی بولے۔

''مولوی صاحب یاسمین کو میں نے بچپن سے دیکھا ہے۔ وہ تو بہت ہی اچھی اور شریف لڑکی ہے۔ شوکت کے ساتھ ہی آپ کے ادارے میں ادیب فاضل کے لیے پڑھ رہی ہے۔ میرا خیال ہے شوکت کو بھی یاسمین پسند ہوگی۔ میں تو جہیز کا دشمن ہوں اور صرف نکاح خوانی میں یقین رکھتا ہوں۔ مجھے تو اچھی تعلیم یافتہ اور باحیا لڑکی چاہیے۔ وہی گھر کا سب سے بڑا سرمایہ ہوتی ہے۔ آپ ایک منٹ رکیں میں شوکت کی والدہ اور شوکت کی دادی جان سے صلاح کر کے آپ کو ابھی بتا دیتا ہوں۔'' ماسٹر خدا بخش کی بات سن کر رحیم بخش چڑ کر اوپر اپنے کمرے میں چلا گیا تھا۔ ماسٹر خدا بخش چند منٹ میں ہی واپس آ گئے، اور ان کے ساتھ ساتھ ہی چھوٹا لڑکا چائے لے آیا۔

''مولوی صاحب چائے لیجیے۔ ہمیں یہ رشتہ منظور ہے۔ اب آپ فرمائیں کہ کیا میں یاسمین کے لیے پیغام بھجوا دوں۔ یا احمد علی صاحب مجھ سے آ کر ملیں گے۔ مجھے تو خود بھی ان کے یہاں جانے میں کوئی عذر نہیں۔''

''وہ آپ سے آ کر مل لیں گے، یہی مناسب رہے گا۔ آپ نے میری تجویز منظور فرمائی اس کے لیے میں آپ کا ممنون ہوں۔''

''ممنون تو مجھے آپ کا ہونا چاہیے کہ آپ نے زحمت فرمائی۔'' ماسٹر خدا بخش بولے۔

اور اس طرح سے تنگ گلی میں ایک اور شادی ہوگئی مگر اس شادی کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ دولہا اور دلہن کے گھر اسی گلی میں ہونے کی وجہ سے، ساری گلی دونوں طرف کے رشتے داروں اور مہمانوں سے بھر گئی اور شوکت میاں گھوڑے پر چڑھنے کی بجائے پیدل تشریف لائے۔ ویسے بھی تنگ گلی میں جو شادی ہوتی تھی اس کے لیے گھوڑا آیا تو گلی سے باہر کیا جاتا تھا اور اگر آنے والی بارات ہوتی تو گھوڑا باہر ہی روک دیا جاتا تھا کیونکہ ایک پرانی شادی میں گھوڑے کو اندر لانے کی کوشش کی گئی تھی تو نالی کے گلی کے بیچوں بیچ ہونے کے سبب کوشش ناکام رہی تھی۔ احمد علی نے ساری رسمیں ادا کیں اور نبھائیں۔ مگر ماسٹر خدا بخش کے صحیح نظریے کے سبب ہی یہ شادی ہر لحاظ سے مثالی تھی۔

دو محبت بھرے دل تو مل گئے مگر یہ راز کبھی نہیں کھلا کہ دونوں کے درمیان اس پہلے نامہ و پیام کا کیا ہوا جو یاسمین اپنی کاپی میں رکھ کر بھول گئی تھی اور یہ کہ یہ ملن مولوی صاحب کی مخلص کوششوں بلکہ دور اندیشی کا نتیجہ تھا!

△ △ △

بے چاری عورت!

فرحت اور عمرانہ گورنمنٹ کالج رانچی میں ایم۔ اے کی طالبات تھیں۔ دونوں نے بی۔ اے بھی اسی کالج سے کیا تھا اور ایم۔ اے میں بھی دونوں کا مضمون ایک ہی تھا یعنی نفسیات۔ دونوں رانچی کے متوسط مگر مقابلتاً آزاد خیال گھرانوں کی لڑکیاں تھیں۔ فرحت کا صرف ایک بھائی تھا، اس سے بڑا جو جمشید پور میں انجنیئر تھا اور جس کی شادی دو سال ہوئے ہوگئی تھی۔ عمرانہ اپنے والدین کی اکلوتی لڑکی تھی اور اس کا کوئی بھائی بھی نہیں تھا۔ فرحت کے ابا میونسپل کمیٹی میں ٹیکس انسپکٹر تھے اور عمرانہ کے والد ایک سرکاری دفتر میں آفیسر تھے۔ فرحت اور عمرانہ بڑی اچھی سہیلیاں تھیں اور دونوں کا ایک دوسرے کے یہاں آنا جانا تھا۔

فرحت ہلکے سانولے رنگ، متوسط قد اور سڈول جسم کی بڑی دلکش لڑکی تھی۔ وہ تقریباً ہر وقت مسکراتی رہتی تھی اور ذرا سا موقع بھی مل جاتا تو کھلکھلا کر بے تحاشہ ہنسنے سے بھی نہ چوکتی۔ اس کی خوشنما مسکراہٹ اور کھنکتی ہوئی ہنسی سارے کالج میں مشہور تھی۔ اس کے چہرے کے خدوخال بھی بڑے جاذبِ نظر تھے۔ عمرانہ بھی اکثر اُسے یہ کہہ کر چٹکی لیتی کہ فرحت تیرے بھرپور ہونٹ اور چمکتے ہوئے خوبصورت دانت تیرا سب سے بڑا سرمایہ ہیں۔

عمرانہ فرحت کے برعکس بڑی گوری چٹی لڑکی تھی۔ وہ بھی ایک حسین، بے عیب اور صاف شفاف چہرے کی مالک تھی۔ اس کی آنکھیں کافی بڑی اور غلافی تھیں

اور وہ کسی کو، خاص طور پر کسی لڑکے کو آنکھیں کھول کر دیکھ لیتی اور وہ اس کے سامنے کھڑا ہوتا تو اسے ایسا محسوس ہوتا کہ وہ ان میں سمایا جا رہا ہے۔ مگر وہ کچھ زیادہ لمبی اور پتلی تھی اور چلتی تو سرسراتی ہوئی بیدِ لرزاں کا گمان ہوتا۔ جتنی فرحت چلبلی اور ہنسوڑ تھی اتنی ہی عمرانہ سنجیدہ اور چپ چاپ تھی۔ وہ مسکراتی بھی کم تھی اور ہنستی تو تقریباً کبھی نہیں تھی، اس وقت بھی نہیں جب فرحت ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو رہی ہوتی تھی۔ فرحت نے ایک دفعہ اسے چڑ کر کہہ دیا۔

''یار تو کبھی تو ہنس لیا کر۔ اللہ اگر مجھے تجھ جیسا رنگ روپ دیتا تو قسم خدا کی... چل جانے دے تجھے میرے بارے میں مغالطہ ہو جائے گا۔ لیکن میری دعا ہے کہ تجھے خوب ہنسنے ہنسانے والا دولہا ملے۔''

نفسیات کا موضوع بڑا وسیع اور دلچسپ تھا اور اس میں انسان اور جانوروں کے نفسیاتی عمل اور ردِ عمل کے تقابلی مطالعے بھی شامل تھے۔ عمرانہ کو یہ جان کر اور پڑھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ جہاں تک نر اور مادہ کے باہمی رشتے اور تعلقات کا سوال تھا مرد کا یہ رویہ عورت کے تئیں، مجموعی طور پر، بڑا افسوسناک تھا۔ مختلف مطالعوں سے یہ ثابت ہو گیا تھا کہ مردوں کی بڑی اکثریت اس معاملے میں، چاہے وہ شادی شدہ ہوں یا غیر شادی شدہ، جانوروں سے بدتر تھی۔ ایک روز امتحانوں کے دنوں میں کالج کے لان میں بیٹھے ہوئے عمرانہ نے اس موضوع پر گفتگو کے دوران فرحت سے کہا۔

''فرحت میں حیران ہوں اور رنجیدہ بھی کہ ہمارے مرد تعلیم یافتہ اور سمجھ دار ہونے کے باوجود بے وفائی کے پیکر کیوں ہوتے ہیں۔ مرد کے لیے کیا یہ لازمی نہیں ہے کہ وہ صرف ایک کا ہو کر رہے۔ وہ کیوں دوسری عورتوں کی طرف اپنی بری نگاہ ڈالتا ہے۔ کیا اخلاقی قدروں کی نگہبان صرف عورت ہے اور یہ مرد کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتیں۔ کوئی بھی مذہب بے راہ روی کی اجازت نہیں دیتا۔ میں تو سچ ایسے مرد کو برداشت نہیں کر سکتی۔''

فرحت پہلے تو مسکرا کر رہ گئی مگر پھر بولی۔

''مرد کا زیادہ گھناؤنا پہلو جو ان مطالعوں میں ابھر کر آیا ہے وہ یہ ہے کہ مرد اپنے باہر رہنے کے مواقع اور وسائل کا فائدہ اٹھا کر اور گناہوں کا مرتکب ہو کر بھی اپنی

بیوی کے سامنے دیوتا بن کر یا معصومیت کا لبادہ اوڑھ کر آجاتا ہے اور زندگی بھر ایسا ہی بنا رہتا ہے۔ اور بے چاری عورت......''

''فرحت'' عمرانہ زیادہ سنجیدہ ہو کر بولی ''فرائڈ نے سچ ہی کہا ہے کہ تشدد اور جنسی بے راہ روی میں مرد اس دھرتی پر سب سے وحشی جانور ہے۔ مرد تو اپنی عورت کی ذرا سی لغزش پر بھی سیخ پا ہو کر اس کی جان تک لینے پر آمادہ ہو جاتا ہے اور خود اپنے متعدد گناہوں کے باوجود ذرا سا بھی متاسف نہیں ہوتا۔ واہ ری دنیا!''

دونوں نے ایم۔اے کا امتحان دے دیا اور گھر بیٹھ گئیں۔ وہ سہانے اور موج مستی کے دن ختم سے ہو گئے۔ بچپن اور نوجوانی کے شروع کے چند سال یوں پنکھ لگا کر اڑ جائیں گے انہوں نے سوچا تک نہیں تھا۔ امتحان کے نتیجے کے آنے تک دونوں کا کالج میں آنا جانا لگا تو رہتا مگر جانے کیوں کالج اب وہ اپنا پُرانا پیارا سا آشیانہ نہیں لگتا تھا۔ اب فرحت کالج کے احاطے میں کلکاریاں مارنے اور کھلکھلا کر ہنستے ہوئے بھی ڈرتی تھی کیونکہ وہ اچانک کالج کی نہیں کالج سے باہر کی بن گئی تھی۔ یونیورسٹی کا ایم۔اے (نفسیات) کا نتیجہ بھی کچھ جلد ہی نکل آیا اور دونوں اچھے نمبروں سے سیکنڈ ڈویژن میں پاس ہو گئیں۔ وہ اسی روز اکٹھی کالج گئیں اور وہاں بہت سی سہیلیوں سے ملنا جلنا ہو گیا۔ پھر وہ ایک ہفتے کے بعد کالج سے اپنی اپنی مارک شیٹ لے آئیں اور اس طرح سے کالج سے بھی ناتہ بالکل ٹوٹ گیا۔ کیونکہ وہ یونیورسٹی کے کانووکیشن میں خود نہیں گئیں، کوئی دو مہینے بعد رجسٹری سے ان کی ڈگریاں انہیں گھر پر ہی مل گئیں۔ وہ دونوں ایک دن بازار گئیں اور انہیں فریم کروالائیں۔ گھر والے ان کے نوکری کرنے کے حق میں نہیں تھے۔ اس لیے دونوں اپنے آپ کو گھر کے کام کاج میں مصروف رکھنے لگیں۔ باہر آنا جانا اور دونوں کا ایک دوسرے سے ملنا جلنا بھی بہت کم ہو گیا۔ عمرانہ کے گھر پر تو فون تھا مگر چونکہ فرحت کے یہاں نہیں تھا، اس لیے فون پر بھی بات چیت کا امکان نہیں تھا۔ زندگی میں ایک ایسا بے کیف اور اکتا دینے والا موڑ بھی آئے گا یہ تو انہوں نے سوچا تک نہیں تھا۔ کتابیں اور رسالے بھی کوئی کہاں تک پڑھے؟۔

مگر نہیں، ایک اور رنگ بھری، کسی سپنوں کی نگری کی طرح، زندگی تو ابھی شروع ہوئی تھی۔ شادی تو ایک ایسا پیارا سپنا ہوتا ہے جس میں چاروں طرف فضا میں

رنگین جھولے ہی لٹکے ہوئے ہوتے ہیں اور یہ سپنا ہر معصوم لڑکی کی ادھ کھلی آنکھوں میں سمایا ہوتا ہے۔ ایک سال میں ہی فرحت اور عمرانہ دونوں کی شادی ہوگئی۔ فرحت کی شادی رشتے داری میں ہی اس کے خالہ زاد بھائی جاوید اختر سے ہوگئی۔ وہ پٹنہ میں انجنیر تھا۔ دونوں نے بارہا ایک دوسرے کو دیکھا تھا اور جاوید تو فرحت کو بہت ہی پسند کرتا تھا۔ مگر فرحت جتنی باتونی اور ہنسنے ہنسانے والی تھی، جاوید اتنا ہی سنجیدہ تھا۔ ہاں اُسے عمدہ مذاق پسند ضرور تھا اور وہ اپنی پسندیدگی کا اظہار مسکرا کر کر دیتا تھا۔ مگر اُسے گھومنے پھرنے عمدہ پکچر دیکھنے اور کتابیں پڑھنے کا بڑا شوق تھا۔ وہ فرحت پر جان چھڑکتا تھا اور فرحت کو بھی اپنے شوہر پر بڑا ناز تھا۔

عمرانہ کی شادی علی عباس سے ہوئی۔ عباس دھنباد کے سول ہسپتال میں ڈاکٹر تھا عمرانہ کے گھر والوں کی عباس کے خاندان سے کوئی رشتے داری یا واقفیت نہیں تھی۔ عمرانہ کے والد نے ایک مشہور انگریزی کے اخبار میں ایک ڈاکٹر لڑکے کے لیے اعلیٰ تعلیم یافتہ اور حسین لڑکی کی ضرورت کا اشتہار دیکھا اور عمرانہ کی پوری تفصیلات کے ساتھ جواب دے دیا۔ کچھ خط و کتابت کے بعد عباس اور اُس کے گھر والوں نے عمرانہ کو رانچی آ کر دیکھ لیا اور رشتہ پکا ہوگیا۔ عباس بھی لمبے قد کا حسین و جمیل لڑکا تھا۔ فرحت اور جاوید اختر بھی شادی میں آئے تھے اور فرحت تو عباس کو دیکھ کر بہت ہی خوش ہوئی تھی۔ اس طرح سے عمرانہ دھنباد پہنچ گئی۔ عباس بڑا خوش مزاج لڑکا تھا اور کہیں بھی بیٹھ جاتا تو اپنی پر لطف اور لچھے دار باتوں سے سب کا دل موہ لیتا۔ اُسے عمرانہ بے حد پسند تھی اور وہ گھر میں ہوتا تو اُس کے کمرے میں ہی گھسا رہتا۔ اُس کا بس چلتا تو وہ اپنے کام پر ہسپتال بھی نہ جاتا۔ وہ عمرانہ کو شام کو اکثر اپنی کار میں گھمانے بھی لے جاتا تھا۔ عباس کے والد بھی بہار سرکار میں ایک اعلیٰ ملازمت سے ریٹائر ہوئے تھے اور انہوں نے دھنباد میں ہی ایک خوبصورت مکان بنوالیا تھا۔ عمرانہ بہت خوش تھی اور خدا کا شکر ادا کرتی کہ اُسے اتنا اچھا شوہر اور گھر بار ملا تھا۔ وہ اپنے آپ کو بہت ہی خوش قسمت سمجھتی تھی اور اُسے اکثر محسوس ہوتا کہ اُس نے عباس کو کیا پالیا زندگی کی ہر شے پالی بلکہ آسمان سے تارے توڑ لیے ہیں۔

فرحت اور عمرانہ ایک دوسرے کو خط لکھتی رہتیں۔ وہ اپنے گھر آنے کا پروگرام بھی ایک ساتھ ہی بنا لیتیں تاکہ دونوں مل سکیں اور کچھ پرانی اسکول اور کالج کی یادیں تازہ

ہو جائیں۔ وہ ایک دوسرے کی شادی میں تو شریک ہوئی ہی تھیں اور ایک دوسرے کے شوہر سے بھی واقفیت ہوگئی تھی۔ چونکہ عام طور پر جاوید اختر اور عباس ہی فرحت اور عمرانہ کو لینے آتے تھے چاروں کو آپس میں مل بیٹھنے کے موقعے بھی میسر آجاتے اور جاوید اور عباس میں خاصی دوستی بھی ہوگئی تھی۔

وقت کا بے آواز پرندہ اپنے پروں کو پھیلائے اُڑتا رہا اور آٹھ دس سال ایسے گزر گئے کہ پتہ ہی نہ لگا۔ مسرتوں بھرے دن یوں بھی تیزی سے گزر جاتے ہیں۔ فرحت ایک پیارے سے بیٹے اور عمرانہ دو پھولوں سے بھی زیادہ خوبصورت لڑکیوں کی ماں بن چکی تھی۔ بچوں کی پیدائش نے دونوں کی زندگی میں قوسِ قزح کے کچھ اور رنگ بھر دیئے تھے۔ بچوں کی پرورش اور دیکھ بھال کی ذمے داریاں تو بڑھ گئی تھیں مگر ان ذمے داریوں کے اردگرد مسرتوں کے کتنے انبار لگے رہتے ہیں، انہیں ماں کا دل ہی اچھی طرح جانتا ہے۔

مختلف شہروں میں رہنے کی وجہ سے اور آج کل کی مصروف زندگی کے سبب جس میں فرصت کی گھڑیاں کم سے کم تر ہوتی چلی جاتی ہیں، فرحت اور عمرانہ کے درمیان خط وکتابت کا سلسلہ بھی اگرچہ ختم تو نہیں ہوا مگر آہستہ آہستہ بہت کم ہوگیا۔ کبھی کبھی چھ سات مہینے میں کسی نے خیر وعافیت کا ایک چھوٹا سا خط ڈال دیا تو ڈال دیا ورنہ نہیں۔ دونوں کے بچے بھی اب اسکول جانے لگے تھے اور اُن کا ہر سال میکے آنا بھی دشوار ہوگیا تھا اور ایک ہی وقت میں دونوں کے رانچی آنے کا وہ امکان بھی نہیں رہا تھا۔

ایک روز فرحت اپنے بیٹے ساجد کو اسکول بھیجنے اور سب کو ناشتہ کرانے کے بعد اپنے کمرے میں معمول کے مطابق اخبار پڑھنے کے لیے بیٹھی تو وہ دوسرے صفحے پر ایک خبر کو پڑھ کر دھک سے رہ گئی اور اس نے تفصیل پڑھی تو اس کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ اس نے آنکھیں بند کر کے اور ہاتھ اٹھا کر خدا سے دعا مانگی کہ یہ خبر عمرانہ کے شوہر عباس کی نہ ہو۔ اس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے پھر اخبار اُٹھایا اور ایک بار پھر خبر پڑھی۔ یہ تفصیلات تو عباس کی ہی تھیں۔ جاوید اختر صبح اتنی جلدی میں ہوتا تھا کہ صرف اخبار کے پہلے صفحے کی سرخیاں پڑھ کر اخبار رکھ دیتا تھا اور پھر شام کو دفتر سے لوٹ کر اطمینان سے پڑھتا تھا۔ اس لیے اُسے تو اِس بارے میں کچھ پتہ ہی نہیں تھا۔ یا خدا یہ کیا ہوگیا تھا۔ فرحت نے فوراً جاوید

کوفون کیا۔ اُسے بھی یقین نہیں آیا اور اُس نے فرحت سے کہا کہ وہ ابھی دفتر میں کسی کا اخبار دیکھ کر اُسے فون کرے گا۔ چند منٹ میں ہی اُس کا فون آ گیا۔

''فرحت میں نے جو اخبار یہاں دیکھا ہے اُس میں تو عباس بھائی کی فوٹو بھی چھپی ہے اور پوری تفصیلات بھی چھپی ہیں۔ انہوں نے واقعی خودکشی کر لی ہے۔ بہت ہی دکھ کی بات ہے۔ تم ایسا کرو ابھی گھر سے عمرانہ کو ایک کال بک کر لو اور اُس سے بات کر کے مجھے بھی بتانا۔ ہم دونوں کو تو وہاں جانا بھی چاہیے۔ میں دفتر سے دو دن کی چھٹی لے لیتا ہوں۔''

فرحت کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ عمرانہ اور عباس کے چہرے اُس کی نظروں کے سامنے گھومنے لگے۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اس کی بچپن کی سہیلی عمرانہ کی خوشیوں بھری زندگی اور اس کا سہاگ یوں لٹ جائے گا۔ اس نے اپنی ڈائری میں عمرانہ کا فون نمبر تلاش کیا اور اُسے کال بک کر لی۔ کوئی آدھ گھنٹے میں ہی کال مل گئی۔ فون شاید عمرانہ کی ساس نے اٹھایا تھا اور جب فرحت نے اپنا نام بتا کر عمرانہ کو فون پر بلانے کے لیے کہا تو انہوں نے عمرانہ کو آواز دیدی۔ فرحت کو فون پر رونے دھونے کی آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔ جب عمرانہ نے فون لیا اور فرحت نے اپنا نام بتایا تو عمرانہ بغیر کچھ کہے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور فرحت سے بالکل بات نہ کر سکی۔

تیسرے دن فرحت اور جاوید دھنباد پہنچ گئے اور اسکوٹر کر کے عمرانہ کے گھر پہنچ گئے۔ سارا گھر ماتم کدہ بنا ہوا تھا اور ایک نحوست سی چھائی ہوئی تھی۔ عباس کے ابا باہر ہی ایک تخت پر غم کی مورت بنے بیٹھے تھے۔ جاوید نے سلام کیا اور مردانے میں جا بیٹھا جہاں کچھ لوگ اور بھی بیٹھے تھے۔ عباس کے ابا بھی وہیں آ گئے اور جاوید نے انہیں اپنے بارے میں بتا کر اپنی دلی ہمدردی ظاہر کی۔ فرحت بُرقعے میں تھی اور وہ سیدھی اندر چلی گئی۔ اس نے بیٹھ کر اور برقعے کی نقاب اٹھا کر اپنے بارے میں بتایا اور بے تحاشہ رونے لگی۔ عورتوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور بے اختیاری میں سب رونے لگیں۔ جب رونا کم ہوا تو چند منٹ کے بعد اسے ایک چھوٹی سی لڑکی عمرانہ کے کمرے میں لے گئی۔ عمرانہ نیچے ہی ایک دری پر بیٹھی ہوئی تھی اور اس نے سر گھٹنوں میں سمایا ہوا تھا۔ دونوں بچیاں اس کے پاس ہی چپ چاپ بیٹھی تھیں مگر فرحت کو دیکھ کر اٹھ کر باہر چلی گئیں۔ بچیوں

کو دیکھ کر فرحت کا کلیجہ منہ کو آ گیا۔ وہ عمرانہ کے پاس بیٹھ گئی اور دونوں ایک دوسرے سے چمٹ کر بے تحاشہ رونے لگیں۔

اگلے دن جب دل کا غبار کچھ دھل گیا اور فرحت اور عمرانہ اکیلی کمرے میں بیٹھی تھیں تو فرحت نے پوچھا۔

''آخر ہوا کیا تھا؟''

''فرحت ایسا لگتا ہے میری قسمت میں یہی لکھا تھا۔ تمہیں یاد ہوگا ایک بار میں نے کالج کے لان میں بیٹھے ہوئے اپنے کورس میں شامل مردوں کے نفسیاتی مطالعوں اور ان کی اخلاقی بے راہ روی کا ذکر کیا تھا۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ مجھ بدنصیب کو بھی اس کا سامنا کرنا پڑے گا اور مجھ پر بھی کچھ ایسی ہی بیتے گی۔ عباس مجھ پر جان چھڑکتے تھے اور میرے بڑے دیوانے تھے میں اُن کی دو بچیوں کی ماں بھی بن گئی مگر اُن کے پیار میں کوئی کمی نہیں آئی۔ مجھ سے کہا کرتے کہ میں دنیا کی سب سے خوبصورت عورت ہوں۔ مگر ساتھ ہی ان کا ہسپتال میں کئی نرسوں سے چکّر بھی چل رہا تھا جس کا مجھے بالکل علم نہیں تھا۔ وہ گھر بھی کافی دیر سے آنے لگے تھے۔ اس وجہ سے اور شاید کسی اور وجہ سے بھی ہسپتال کے بہت سے لوگ اُن کے خلاف بلکہ ان کے دشمن تھے۔ گزشتہ منگل کے دن ہسپتال کے لوگوں نے انہیں کسی نرس کے سات ہسپتال کے ایک کمرے میں رنگے ہاتھوں پکڑ لیا۔ انہوں نے فون کر کے پولیس کو پہلے ہی سے بلوا لیا تھا۔ وہ رات کو بہت دیر سے اپنی ضمانت وغیرہ کروا کر لوٹے۔ بہت پریشان تھے مگر مجھ سے بولے کہ ہسپتال میں کسی ایمرجنسی کیس کی وجہ سے انہیں رکنا پڑا تھا۔ ان کے چہرے پر کچھ مار پیٹ کے نشان بھی تھے۔ وہ مجھ سے بغیر کچھ بولے کروٹ لے کر لیٹ گئے۔ اگلے دن گھر سے ہسپتال گئے مگر...''

یہ کہہ کر عمرانہ پھر رونے لگی اور کچھ دیر روتی ہی رہی۔ فرحت اسے حوصلہ دیتی رہی عمرانہ کچھ دیر میں سنبھلی تو نظر جھکا کر دھیرے سے بولی۔

''ہسپتال پہنچے تو انہیں پتہ چلا کہ انہیں معطّل کر دیا گیا تھا۔ نرس کے بیان پر کہ اس کے ساتھ زبردستی کی گئی تھی پولیس کیس تو بن ہی چکا تھا۔ سارے ہسپتال میں ہی نہیں تمام شہر میں یہ خبر پھیل گئی تھی اور اگلے دن اخبارات میں بھی چھپ گئی تھی۔ پھر پولیس گیارہ بجے یہ خبر لے کر گھر آ گئی کہ انہوں نے ہسپتال کے ایک خالی کمرے میں اپنے

آپ کو اندر سے بند کر کے پنکھے سے لٹک کر خودکشی کر لی تھی۔''

عمرانہ یہ کہہ کر گم صم سی ہو کر بیٹھ گئی اور اپنا سر گھٹنوں پر رکھ لیا۔ شاید وہ دھیرے دھیرے، بے آواز، رو رہی تھی۔ چند لمحوں کے بعد اس نے اپنا سر اٹھایا، آنسوؤں کو پونچھا اور بولی۔

''فرحت انہوں نے یہ کیا کیا۔ شاید وہ ایسی بدنامی کے بعد میرا اور گھر والوں کا سامنا نہیں کر سکتے تھے۔ مگر میں تو عورت تھی اور انہیں معاف کر دیتی۔ انہوں نے بزدلی کا یہ قدم کیوں اٹھایا۔ وہ مجھے اور ان دو معصوم بچیوں کو زندگی کے اس تپتے اور جھلستے ریگ زار میں کس کے سہارے چھوڑ گئے؟''

عمرانہ پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ فرحت سوچنے لگی کہ عمرانہ پر جو یہ مصیبت کا پہاڑ ٹوٹا تھا وہ اس کے دل میں کب سے جاگزیں مردوں کی اخلاقی بے راہ روی کے بارے میں اس کے شکوک اور خدشات کا نتیجہ تھا، یا وہ واقعی بدقسمت تھی اور یا وہ ایسے سماجی ڈھانچے کا شکار تھی جس میں گناہ کا ارتکاب تو مرد کرے گا اور ساری عمر روئے گی بے چاری عورت!

جات نہ پوچھو سادھو کی

بچھوا گاؤں کے باہر اور رماندی کے کنارے ایک اونچے ٹیلے پر بولوشاہ کی سادھی تھی۔ بچھوا گاؤں صدیوں پرانا گاؤں۔ رہا ہوگا کیونکہ بولوشاہ کے بارے میں یہ مشہور تھا کہ اُسے گزرے ہوئے دوسو سال ہوگئے ہیں اور وہ بچھوا گاؤں کا ہی باشندہ تھا۔ یہ سادھی دو کمروں، ان کے چاروں طرف برآمدے، کھلی زمین، چاردیواری اور اس میں ایک بڑے دروازے پر مشتمل تھی۔ ایک کمرے کی چھت پر، جس میں بولوشاہ کی ایک بڑی تصویر اور چند اشیاء رکھی ہوئی تھیں لمبے بانس سے ایک لال رنگ کا جھنڈا ہوا میں لہراتا رہتا تھا۔ سادھی کا باہر کا دروازہ چوبیس گھنٹے کھلا رہتا تھا۔ سادھی کے دوسرے کمرے میں اس کا رکھوالا برجو رہتا تھا۔ برجو کی عمر پچاس سال کی ہوگی اور وہ خود بھی بولوشاہ کا بھگت تھا۔ اس کا اس دنیا میں کوئی آگے پیچھے نہیں تھا۔

بولوشاہ کے بارے میں کئی اور باتیں بھی مشہور تھیں۔ سب سے مقدم تو یہ کہ وہ بہت پہنچا ہوا اور کراماتی فقیر تھا۔ گاؤں میں چونکہ پچھڑی جاتیوں کے ہندوؤں کی اکثریت تھی ان کا کہنا تھا کہ وہ اہیر جات کا سادھو تھا۔ سارے گاؤں میں صرف ایک مسلمان کنبہ تھا، جمن لوہار کا اور اس کے گھر والے بھی بولوشاہ کو مانتے تھے۔ مگر چونکہ پنچایت پر اونچی جات کے ہندوؤں کا قبضہ تھا اور پنچایت کے ذمے بولوشاہ کی سادھی کا انتظام اور دیکھ بھال بھی تھا، بچھوا کے برہمنوں اور کاشتکاروں نے چند برسوں سے یہ کہنا شروع کر دیا تھا کہ بولوشاہ کا جنم ایک برہمن گھرانے میں ہوا تھا۔ آس پاس کے دیہات کے کچھ بوڑھے لوگوں کا یہ بھی کہنا

تھا کہ بولوشاہ تو مسلمان تھا!

بہر حال اس سمادھی پر مسلمان تو کوئی اِکا دکا ہی کبھی آ جاتا مگر ہاں چھوٹی بڑی ذات کے ہندو یہاں موقع بہ موقع اکٹھے ہوتے تھے اور سب مل کر پرارتھنا کرتے اور بھگتی کے گیت گاتے تھے۔ سمادھی پر منت مانگنے بھی لوگ آتے تھے اور کہا جاتا تھا کہ اگر کوئی دکھی آدمی یا عورت سچے دل سے بولوشاہ کی سمادھی پر منت مانگتا تھا تو وہ پوری ہو جاتی تھی۔ سمادھی پر جو بھی آتا تھا وہ پھل، پھول اور نقدی کی صورت میں کچھ چڑھاوا بھی چڑھاتا تھا اور اس سے برجو کا گزارہ اور پنچایت کی نگرانی میں سمادھی کی دیکھ بھال اور مرمت وغیرہ کا کام بھی ہوتا تھا۔

بولوشاہ کی سمادھی پر جب بھی لوگ اکٹھے ہوتے تو بھجن کیرتن کے بعد بچھوا گاؤں کے پردھان اور ایک دو اور لوگ بولوشاہ کی زندگی کے کچھ واقعات بھی لوگوں کو سناتے خاص طور پر وہ جن میں لوگوں کے سنکٹ کی گھڑی میں بولوشاہ نے کوئی عجوبہ کر رکھایا ہو۔ یہ واقعہ تو بار بار دہرایا جاتا کہ اُن کے زمانے میں ایک دفعہ بھیانک کال پڑا تھا۔ سوکھے کی وجہ سے ساری دھرتی جگہ جگہ سے پھٹ گئی تھی۔ پانی کا ایک قطرہ بھی کہیں دیکھنے کو نہیں تھا کیونکہ ندی، نالے اور کوئیں سوکھ گئے تھے۔ گاؤں والے فریاد لے کر بابا بولوشاہ کے پاس پہنچے کہ بابا کچھ کرو ورنہ گاؤں کا انت ہو جائے گا۔ بولوشاہ نے سب کو اپنے سامنے بٹھا کر شانت ہو جانے کی تلقین کی۔ خود آسمان کی طرف تاک کر منہ ہی منہ میں کچھ بولتے رہے۔ آدھ گھنٹے تک اُن کا یہی عمل رہا۔ پھر بولے گھر جاؤ اوپر والا بھلی کرے گا۔ لوگ ابھی اپنے گھروں تک بھی نہیں پہنچے تھے کہ سارا آسمان بادلوں سے گھر گیا۔ بادل گرجنے لگے اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ زبردست بارش ہوئی ہے کہ جل تھل ایک ہو گئے۔ اس واقعے کو سن کر اکٹھی ہوئی بھیڑ چند منٹ تک 'بابا بولوشاہ کی جے' کے نعرے لگاتی۔

ایک دفعہ بچھوا گاؤں کے گرد و نواح میں زبردست سیلاب آیا کیونکہ موسلا دھار بارش کئی دنوں سے برس رہی تھی اور تھمنے میں نہیں آ رہی تھی۔ رمنا ندی کا پانی کناروں کو توڑ کر بُری طرح میلوں تک پھیل گیا تھا۔ آنے جانے کے سب راستے مسدود ہو گئے تھے اور لوگوں کی روزمرہ کی زندگی بری طرح متاثر ہو گئی تھی۔ سرکار کا راحت کا کام بھی بڑی مشکل سے چل رہا تھا اور کشتیوں کے ذریعے پھنسے ہوئے لوگوں کو محفوظ جگہوں پر لے جانے تک

محدود تھا۔ ایسے میں بولوشاہ کی سمادھی بھی بچھوا گاؤں سے کٹ گئی تھی مگر سیلاب کا پانی اس کے اندر نہیں گھس پایا تھا کیونکہ یہ کافی اونچائی پر تھی اور اندر سے پانی کے اخراج کا بڑی بڑی کئی نالیوں کی صورت میں مناسب انتظام تھا۔ مگر اندر برجو گھبرایا ہوا تھا اور اس نے باہر کا دروازہ بھی اندر سے بند کرلیا تھا۔ تین دن سے لگاتار بارش ہو رہی تھی اور وہ اندر دبکا ہوا بیٹھا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ بچھوا گاؤں سے بھی کوئی آدمی اُس کی خبر تک لینے نہیں آیا۔ باہر حالات کتنے خراب تھے اس کا اُسے کوئی خاص اندازہ نہیں تھا۔ مگر جب چوتھے دن بھی بارش نہیں تھمی تو اس نے بوری اوڑھ کر باہر کا دروازہ کھولا تو یہ دیکھ کر بڑا خوفزدہ ہوا کہ اس کے سامنے تو دور تک پانی کی جھیل بنی ہوئی تھی اور اُس نے ایک دو جانوروں کی لاشیں بھی پانی میں تیرتی ہوئی دیکھیں۔ وہ فوراً واپس ہولیا اور سوچتا ہوا اپنے کمرے میں بیٹھ گیا۔ شکر ہے کہ اس کے پاس دو کنستروں میں رکھا ہوا کھانے کا اتنا سامان مٹھائی وغیرہ تھا کہ وہ ابھی کئی اور دنوں تک بغیر کسی مدد کے رہ سکتا تھا۔

اچانک باہر بادل گرجے اور بجلی کی ایک دل دہلانے والی کڑک سے برجو بھی لرز سا گیا۔ کمرے میں تو پہلے ہی سے اندھیرا تھا۔ اُس نے خیال کیا کہ شام ہونے کو ہوگی۔ کچھ ڈر سے اور کچھ اکتاہٹ سے اس نے سونے کی سوچی۔ اس نے لالٹین جلا کر اس کی بتی اتنی نیچی کردی کہ کمرے میں ہلکی سی روشنی بھی رہے اور لالٹین بجھے بھی نہیں۔ پھر اس نے اپنے کمرے کی کنڈی لگادی اور ''جے بابا بولوشاہ'' کہہ کر اپنی چارپائی پر لیٹ گیا۔

جانے رات کو بارش کب تھم گئی تھی کہ صبح برجو کی جو چار بجے آنکھ کھلی تو باہر چاندنا تھا اور چاردیواری کے اندر کی زمین گیلی نہیں تھی۔ اس نے سمادھی کے باہر کا دروازہ کھول کر چاروں طرف جھانکا تو پانی بھی بہت اتر گیا تھا۔ مگر، اس نے اندازہ لگایا کہ لوگوں کا آنا جانا تو ابھی ایک دو روز اور ممکن نہیں ہوگا۔ وہ اپنی ضروریات سے فارغ ہوکر اور نہادھوکر سمادھی والے کمرے میں گیا اور جھاڑن سے وہاں کی ہر چیز کو جھاڑ کر اپنی اپنی جگہ پر قاعدے سے لگادی۔ پھر آلتی پالتی مار کر بابا کی تصویر کے سامنے بیٹھ گیا اور سر جھکا کر دل ہی دل میں پوجا کرنے لگا۔

دوپہر کے بعد مطلع صاف تھا مگر سورج کبھی اکادکی بدلی کے پیچھے منہ چھپالیتا اور کبھی جھانک کر مسکرانے لگتا۔ موسم ویسے ٹھنڈا ہی تھا کیونکہ ہر چیز بھیگی بھیگی سی تھی اور

ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ پانی چاروں طرف تیزی سے کم ہو رہا تھا اور کہیں کہیں تو زمین بھی دکھنے لگی تھی۔

ایک سنسان سی شام سادھی پر اتر آئی۔ صرف شام کو درختوں پر بسیرا لینے والے پرندوں کی چوں چوں اس پراسرار خاموشی کو چیر رہی تھی۔ سیلاب اور بارش کے دنوں میں یہ چوں چوں بھی سنائی نہیں دی تھی اور یہ پرندے سہمے ہوئے جہاں پناہ ملی بیٹھے رہے ہوں گے۔ برجو اندھیرا پھیلتے ہی اپنے ڈربے میں گھس گیا۔ دوپہر کی طرح سوکھے لڈو کنستر میں سے نکال کر پانی کے ساتھ کھائے اور لالٹین جلا کر اور اس کی بتی کو نیچے کر کے اپنی کھٹیا پر لیٹ گیا۔ اسے لیٹے ہوئے ابھی کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ باہر چبوترے پر کسی نے چڑھ کر اس کی کنڈی کھڑکھڑا دی۔ وہ کچھ ڈر سا گیا کہ ایسے میں کون آدھمکا اور کیا آنے جانے کے راستے کھل گئے تھے؟ اُسے امید نہیں تھی کہ اس وقت کوئی بچھوا گاؤں سے آیا ہوگا۔ اس نے آج باہر کا دروازہ بھی بند نہیں کیا تھا۔ اس نے سر پر ٹوپی رکھی اور جوتی پہنی۔ پھر بائیں ہاتھ میں لالٹین اٹھا کر اور دائیں ہاتھ میں لاٹھی سنبھال کر وہ دروازے کی طرف بڑھنے ہی والا تھا کہ کسی نے زور سے نعرہ لگایا۔

''یا مصطفیٰ، یا علی۔ بچہ دروازہ کھولو۔''

ہیں مسلمان! برجو ٹھٹھک کر رہ گیا۔ کسی درویش یا فقیر کی آواز معلوم ہوتی ہے، اس نے سوچا۔ لیکن اس سادھی پر کبھی کوئی مسلمان فقیر نہیں آیا۔ شاید آس پاس کے گاؤں کا کوئی مسلمان مصیبت کا مارا ادھر آ پھٹکا ہے۔ پھر ایک اور زور کا نعرہ۔

''یا اللہ، یا مصطفیٰ۔ دروازہ کھولو بچہ۔''

برجو نے چٹخنی اتاری اور دروازہ کھول دیا۔ وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ ایک نہیں دو آدمی تھے اور دونوں اپنے لباس اور حلیے سے مسلمان فقیر معلوم ہوتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سفید داڑھی اور پگڑی والا فقیر کوئی بڑا فقیر تھا اور اس کے ساتھ اس کا کوئی چیلا یا مرید تھا۔ برجو بڑا حیران ہوا کہ ان کے کپڑے پانی میں بھیگے ہوئے نہیں تھے کیونکہ بارش نہ سہی کہیں تو باڑھ کے پانی میں سے گزر کر آئے ہوں گے۔

''کہیئے بابا کیسے آنا ہوا۔ اس طوفان میں؟''

''بچہ آسمان تلے آ کر دیکھ۔'' فقیر بولا ''طوفان تھم گیا ہے۔ ندی کا پانی

اتر گیا ہے۔ راستوں سے پانی بہہ گیا ہے۔ زمین پر نمی اور کیچڑ تو ابھی کئی دن تک رہے گا۔''

برجو نے برآمدے سے نکل کر آسمان کی طرف دیکھا مگر یقین نہیں آیا۔ نیلے آسمان میں ایک منہ دھلا چاند ہلکورے لے رہا تھا اور ان گنت تارے آنکھیں مٹکا رہے تھے۔ فقیر اور اس کا چیلا بھی برآمدے سے اتر آئے تھے۔ فقیر بولا۔

''بچہ ہمارے لیے اپنے برابر کا کمرہ کھول دو۔ ہم رات کو یہیں ٹھہریں گے اور صبح چل دیں گے۔ کھانے کی کوئی بھی چیز پاس ہو تو دے دینا، ورنہ ویسے ہی سو رہیں گے۔''

''بابا'' برجو بولا'' کھانے کو میرے پاس صرف کچھ سوکھے لڈو اور چھوارے ہیں۔ وہ کہیں تو لا دوں۔ رہا سوال رات گزارنے کا تو بابا یہ تو سنت بولو شاہ کی سادھی ہے، یعنی ہندوؤں کا پوتر ستھان ہے۔ مسلمان کبھی کوئی آ گیا تو منّت مانگ کر چلا گیا۔ ویسے بھی یہاں رات کے ٹھہرنے کا کوئی انتظام نہیں۔ پھر جس کمرے کو آپ کھلوا رہے ہیں، وہی تو بابا کی سادھی ہے اور اسی میں بابا کی چیزیں رکھی ہیں۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اگر میں نے آپ کو اپنے کمرے میں یا باہر برآمدے میں بھی ٹھہرنے دیا اور گاؤں والوں کو خبر مل گئی کہ میں نے دو مسلمان فقیروں کو یہاں ٹھہرایا تو نہ جانے وہ میرے ساتھ کیا سلوک کریں۔ بابا آپ دونوں مسلمان ہیں نا؟''

''بچہ ہمیں تمہاری مسلمان والی بات سمجھ میں نہیں آئی۔ اہل اللہ کا ایک ہی مذہب ہوتا ہے اور وہ ہے تلاشِ حق اور تلاش حق میں سبھی شامل ہیں، ہندو، مسلمان، سکھ اور عیسائی۔ حضرت کبیر کی وہ بات شاید تم نے نہیں سُنی کہ جات نہ پوچھو سادھو کی۔ خیر ہم تمہیں تکلیف دینا نہیں چاہتے۔ چلتے ہیں بچہ۔ خدا تمہارا بھلا کرے۔''

اور یہ کہہ کر دونوں نے ایک بار پھر، یا مصطفیٰ، یا علی، کا نعرہ لگایا اور سمادھی سے باہر نکل گئے۔

برجو نے آگے بڑھ کر باہر کے دروازے کی کنڈی لگا دی اور واپس اپنے کمرے میں آ کر لیٹ گیا۔ لیکن اسے نیند نہیں آئی اور وہ دیر تک ان فقیروں کے بارے میں سوچتا رہا۔ اسے ایک گناہ کا احساس بھی ہوا کیونکہ فقیر بھوکے تھے اور وہ اپنی بوکھلاہٹ میں انہیں کنستر میں پڑے ہوئے لڈو اور چھوارے بھی نہیں کھلا سکا تھا۔ یہ سمادھی بھی کیا ہوئی جہاں دو پرانی نہ شرن پا سکے، نہ اپنا پیٹ بھر سکے۔

صبح سویرے اُٹھ کر برجو نے ساری سمادھی مین جھاڑو لگادی اور باہر کا دروازہ بھی کھول دیا کیونکہ اب جب باڑھ کی حالت میں کافی سدھار آ گیا تھا، لوگوں کا سمادھی میں آنا جانا تو پھر شروع ہو جائے گا۔ اُس نے باہر بھی جھانک کر دیکھا۔ راستے تو اب تقریباً صاف ہو گئے تھے اور اس نے دور کھیتوں میں کسانوں کو پانی نکالتے اور جھاڑ جھنکار صاف کرتے بھی دیکھا۔ سب سے زیادہ تو اُسے یہ امید بندھ گئی کہ شاید آج کئی دنوں کے بعد اُسے گاؤں والوں کا لایا ہوا تازہ کھانا کھانے کو مل جائے۔

کام سے فارغ ہو کر برجو اپنی کھٹیا گھسیٹ کر برآمدے میں لے آیا اور اطمینان سے بیٹھ گیا۔ ابھی بیٹھا ہی تھا کہ چند آدمی سمادھی کے اندر آ گئے۔ اس نے نظر اٹھا کر دیکھا اور چارپائی سے اٹھ کر تیزی سے آگے بڑھا کیونکہ یہ تو گاؤں کے مکھیا جے پال اور سمادھی کی پربندھک کمیٹی کے دوسرے سب ممبر تھے اور ان کے ہاتھوں میں کھانے پینے کا سامان تھا۔ جے پال بولا۔

''برجو ہم سب ہی بری طرح بارش اور باڑھ کے پانی میں گھر گئے تھے۔ تمہارے پاس پتہ نہیں کچھ کھانے پینے کو تھا یا نہیں۔ اب ہم تمہارے لیے اور جو بابا یہاں ٹھہرے ہوئے ہیں ان کے لیے تازہ پوریاں، آلو اور سیتا پھل کی سبزی اور حلوہ بنوا کر لائے ہیں۔ پہلے بابا اور ان کے ساتھی کو کھلا دیں۔ کہاں ہیں وہ۔ کیا ابھی اُٹھے نہیں؟''

برجو گھبرا گیا۔ پہلے وہ اپنی کھٹیا اٹھا لایا اور پھر برآمدے میں کھڑی دوسری چارپائی بھی لے آیا۔ دونوں کو آمنے سامنے ڈال کر اس نے مکھیا جے پال اور ان کے ساتھ آئے چار دوسرے آدمیوں کو ان پر بیٹھنے کو کہا۔ جب وہ بیٹھ گئے تو کھڑا ہوا برجو ہاتھ جوڑ کر بولا۔

''سرکار دو مسلمان سنت فقیر کل شام کو خراب موسم میں ضرور آئے تھے۔ وہ بھوکے بھی تھے اور رات یہاں گزارنا چاہتے تھے۔ میرے پاس کچھ لڈّو اور چھوارے تھے اور میں انہیں کھلا دیتا مگر یہاں ٹھہرنے کے لیے میں نے ہاں نہیں کی کیونکہ نہ تو جگہ تھی اور دوسرے وہ مسلمان تھے۔ خیر میں اپنا کمرہ انہیں دے دیتا اور ٹھنڈ کے باوجود خود برانڈے میں کمبل اوڑھ کر پڑا رہتا مگر ڈر گیا کہ ہندوؤں کی اس سمادھی میں میں نے دو مسلمانوں کو ٹھہرا لیا تو آپ لوگ مجھے معاف نہیں کریں گے اور جانے کیا سزا دیں۔ وہ میری بات سن کر باہر نکل گئے اور کچھ کھایا پیا بھی نہیں۔''

''یہ تو نے بڑا غضب کیا برجو'' جے پال بولا'' وہ بڑے پہنچے ہوئے سنت فقیر تھے۔ جانے کل صبح سخت بارش میں اور گھٹنوں گھٹنوں پانی کو پار کر کے وہ اچانک بچھوا گاؤں کیسے اور کہاں سے پہنچے۔ ہم نے انہیں پنچایت گھر میں ٹھہرایا۔ گاؤں والے خوب سیوا اور آؤ بھگت کرنا چاہتے تھے مگر صرف دو روٹی ساگ سے کھا کر بیٹھ رہے۔ سہ پہر کو بہت سے گاؤں والے ان کے پاس آئے کہ بابا ہمیں اس بارش اور باڑھ کے پانی سے بچاؤ ورنہ فصلیں برباد ہو جائیں گی اور مویشی ختم ہو جائیں گے۔ منہ سے کچھ نہیں بولے مگر انگلی آسمان کی طرف اٹھا دی۔ پھر شاید کچھ دعا اور عبادت کی اور آدھ گھنٹے تک سر نہ اٹھایا۔ شام سے پہلے ہی بارش رک گئی اور پانی تیزی سے کم ہونا شروع ہو گیا۔ برجو یہ چمتکار تھا۔ ہم انہیں گاؤں میں کچھ دن اور روک کر انکی سیوا کرنا چاہتے تھے مگر وہ ہمارے پیچھے چوپال کے رامو کاکا یہ کہہ کر چلے گئے کہ اب چلتے ہیں۔ رات کو بولو شاہ کی سادھی پر ٹھہریں گے اور اگلے دن آگے چل پڑیں گے۔ رامو کاکا نے روکنے کی کوشش کی اور مجھے بلانے آدمی بھی گھر بھیجا مگر جب تک میں پہنچا وہ جا چکے تھے۔ ہم نے سوچا کہ صبح سویرے سادھی پر مل لیں گے۔ صبح ہمارا سادھی کا راستہ صاف تھا، صرف کہیں کہیں ذرا سا کیچڑ تھا۔ آرام سے آگئے۔''

اس کے بعد گہری خاموشی چھا گئی۔ سب کے سر جھکے ہوئے تھے جیسے کوئی ان سے بڑا گناہ یا قصور سرزد ہو گیا ہو۔ کھانے کی دونوں پوٹلیاں چارپائی پر رکھی تھیں۔ برجو بھی وہیں فرش پر سر جھکا کر بیٹھ گیا۔ اس سکوت کو چودھری سری چند نے توڑا۔

''جو ہونا تھا سو ہو گیا۔ اس میں برجو کا کوئی اپرادھ نہیں۔ اس نے نیم انوسار ٹھیک کیا۔ مگر میں کہتا ہوں کہ یہ کوئی مندر تھوڑی ہے۔ سادھی ہے جیسے مسلمانوں کا مقبرہ یا مزار۔ مقبرے اور مزار پر تو سینکڑوں ہندو شردھا پور وک جاتے ہیں۔ کوئی روک تھام یا مناہی نہیں۔''

سب نے حامی بھری۔ جے پال بولا۔

''سادھی کی ساری پربندھک کمیٹی تو اس وقت یہاں بیٹھی ہے۔ بس یہ فیصلہ ہوا کہ یہ سادھی ہر جات اور دھرم کے لوگوں کے لیے کھلی رہے گی اور سنت، سادھو اور فقیر چاہے وہ کسی مت اور مذہب کے ہوں یہاں ٹھہر سکیں گے۔ اس کے لیے ایک بڑا کمرہ اور بھی بنوا دیں گے۔''

''بالکل ٹھیک فیصلہ ہے'' بھاگے رام نے کہا ''سنت فقیروں میں دھرم کا بھید بھاؤ مور کھتا ہے۔ لیکن بھئی اس فیصلے کا کل ہی ایک بورڈ لکھوا کر سمادھی کے باہر دروازے پر لگوا دو۔''

''یہ کام بھی ہو جائے گا۔ اب چلیں؟''

''اور یہ حلوہ پوری اور سامان؟'' بھیکو رام بولا ''درویش جی تو چلے گئے مگر اتنے سارے سامان کو برجو اکیلا تھوڑا ہی کھائے گا۔ ہم بغیر ناشتہ کیے چلے تھے کہ درویش جی کو کھلانے کے بعد کریں گے۔ اب اتنے اچھے فیصلے کے بعد ہم سب یہیں ناشتہ کر لیتے ہیں۔ چل برجو پمپ سے ایک بالٹی پانی کی بھر لے اور تو بھی ہمارے ساتھ کھائیو۔''

برجو نے ہینڈ پمپ چلا کر پانی کی بالٹی بھر لی اور لوٹا اور گلاس لے آیا۔ پہلے جے پال نے برجو کو ساری چیزیں کھانے کو دیں اور وہ برآمدے میں بیٹھ کر کھانے لگا۔ سورج کب کا نکل آیا تھا اور سمادھی کے آنگن میں ایک خوشگوار دھوپ اتر آئی تھی۔ جے پال اور اس کے ساتھیوں نے بھی پوری اور حلوہ وغیرہ ہاتھ میں ہی لے کر کھانا شروع کر دیا۔ سب کو افسوس ضرور تھا کہ ایک درویش سمادھی میں بغیر ٹھہرے اور کھائے پیئے یوں چلا گیا تھا۔ مگر سچے فقیر تو کچھ دینے آتے ہیں، لینے نہیں۔ اگر یہ درویش نہ آتا تو سمادھی کے بارے میں یہ صحیح فیصلہ وہ شاید کبھی نہ لے پاتے!

ایشور، اللہ، تیرو نام!

جیتو اور ڈھیلو، بتیا گاؤں کے یہ دو نوجوان پہلوان، ساتھ ساتھ چلتے تو رام لکھن کسان کے بیلوں کی جوڑی لگتے۔ ویسی ہی مضبوطی، قد کاٹھ اور پھرتی اور مشقت آشنا جسم۔ یہ نام دونوں کے اصل نام نہیں تھے۔ جیتو قادر بخش لوہار کا بیٹا خدا بخش تھا مگر گاؤں کے اکھاڑے میں اپنے زور اور بل کی بنا پر اپنے مخالف پہلوان کو چند منٹوں میں دھول چٹا دیتا۔ لوگوں کو یاد نہیں تھا کہ اس نے کبھی کوئی کشتی ہاری تھی۔ اس کی اس صفت کی بنا پر لوگوں نے اسے خدا بخش کی بجائے جیتو کہنا شروع کر دیا تھا اور اب تو یہی اس کا نام پڑ گیا تھا حتی کہ اس کے گھر والے بھی اُسے جیتو کہا کرتے تھے۔ کچھ ایسا ہی اس کے جگری دوست ڈھیلو کے ساتھ ہوا تھا۔ اس کا اصل نام شاموتھا اور وہ کسان رام پرشاد کا بیٹا تھا۔ ڈھیلو جسم کا تکڑا تھا مگر کشتی کے داؤ پیچ سے ناواقف تھا اور جب اس نے اکھاڑے میں زور کرنا شروع کیا اور کشتیاں لڑیں تو کئی مہینوں تک وہ ایک بھی کشتی نہیں جیت سکا۔ گاؤں میں اسی بنا پر اُسے ڈھیلا کہنا شروع کر دیا گیا جو آہستہ آہستہ بگڑ کر ڈھیلو ہو گیا۔ اگر چہ بعد میں اس نے بھی پہلوان کے طور پر اپنی دھاک جمائی اور خوب کشتیاں جیتیں مگر اس کا نام ڈھیلو ہی رہا۔ گھر والے بھی اُسے اسی نام سے بلاتے تھے۔

وقت کا کبھی بوڑھا نہ ہونے والا پرندہ ہمیشہ کی طرح اپنے پر پھیلائے بے آواز اڑتا رہا حتی کہ آٹھ دس سال گزر گئے۔ مگر نیچے دھرتی پر انسانی سرگرمی تو اگر شوریدہ سر نہیں، شور وغل سے پر قائم رہتی بلکہ بڑھتی رہتی ہے، شہروں میں کہیں زیادہ اور دیہات

میں کم۔ جیتو اور ڈھیلو نے بھی پہلوانی چھوڑ دی تھی اور دونوں کی شادی نزدیک کے گاؤں میں کئی سال ہوئے ہو گئی تھی۔ جہاں جیتو دو بیٹوں کا باپ بن گیا تھا وہاں بدقسمتی سے ڈھیلو ابھی بے اولاد تھا۔ اس کی پریشانی شاید ڈھیلو سے زیادہ اس کی بیوی رامی کو تھی اور سب سے زیادہ اُس کی بیوہ ماں اوم وتی کو تھی۔ اوم وتی اگرچہ ساٹھ سال سے اوپر کی تھی مگر ہر طرح سے تندرست تھی اور گھر کا کام کرنے کے علاوہ، گاؤں کے جان پہچان کے گھروں میں جاتی اور اُٹھتی بیٹھتی بھی تھی۔ اوم وتی نے بہت ٹونے ٹوٹکے کئے اور علاج بھی جو جس نے بتایا کرایا مگر رامی کی گود ہری نہ ہوئی۔ گاؤں میں دوسرے، تیسرے سال تک کسی نئی بہو کے بچہ نہ ہو تو رشتے داروں اور اڑوس پڑوس میں اس کا ذکر ہوتا رہتا تھا اور ڈھیلو اور رامی کے بیاہ کو تو اب پورے چھ سال ہو گئے تھے!

گاؤں کا اکھاڑہ بھی جو مدت سے گاؤں کے نوجوانوں اور لڑکے بالوں کی سرگرمی کا مرکز رہا تھا اب دو سال سے سونا پڑا تھا۔ جانے ان چھوٹے بڑے لڑکوں کی وہ ٹکڑیاں کہاں ہوا ہو گئی تھیں جو صبح سویرے اپنے لنگوٹ کسے اور کڑوے تیل کی شیشی ہاتھ میں لیے اکھاڑے پہنچ جاتی تھیں۔ اب تو اکھاڑے کی زمین بھی پتھر کی طرح سخت ہو گئی تھی اور اس پر جھاڑ جھنکاڑ اُگ آیا تھا۔ یہ زمین چچا کریم کی تھی۔ جب انہوں نے اکھاڑے کی یہ ابتر حالت دیکھی تو اس پر اپنے دو آدمی لگوا کر زمین کو صاف کروا کر کھدوا دیا اور اس میں سرسوں بو دی۔

اس عرصے میں بتیا گاؤں میں کچھ پراسرار سرگرمیاں بھی دیکھنے میں آئیں۔ یہ بظاہر دھرم، مذہب اور سیاست سے جڑی تھیں۔ سیاست تو گندی ہوتی ہی ہے مگر ناسمجھ اور گمراہ لوگ بلکہ شرارت پسند عناصر جب دھرم اور مذہب کو اپنے ہتھکنڈوں کا آلۂ کار بناتے ہیں تو نتیجہ نفرت اور خون خرابے کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ جب بتیا میں ایسے خطرے نے سر اٹھایا تو پنچایت کے پردھان امجد علی نے اپنے گھر پر پنچائت بلائی۔ اس میں انہوں نے گاؤں کے سب سے بڑے کسان اور اپنے دوست رام اوتار کو بھی بلایا۔ اس کے علاوہ احمد بخش اور جیون رام کو بھی طلب کیا جن کی زمین یا گھر کو باہر والے کچھ آدمی اس مطلب کے لیے استعمال کر رہے تھے۔ امجد علی نے سب کو ساری اونچ نیچ سمجھا کر کہا۔

''بتیا میں ہمارے پرکھوں کے زمانے سے سب مل جل کر رہ رہے ہیں۔ یہ امن

کا ماحول اور بھائی چارہ میں ہرگز ختم نہیں ہونے دوں گا چاہے اس کے لیے مجھے اپنی جان کی قربانی کیوں نہ دینی پڑے۔ کچھ تبدیلی ہی کرنا ہے تو اس گاؤں کا نام رام رحیم نگر، رکھ دو تا کہ ہم سب کی زبان سے رام رحیم تو ادا ہو۔ ہمارے ہندو بھائی ہمیں سلام کہتے ہیں اور ہر روز بہت سے مسلمان ہندوؤں کو نمستے کہتے ہیں تو کیا ہم لا مذہب ہو جاتے ہیں؟''

اور یہ پنچائت اسی وقت ختم ہوئی جب احمد بخش اور جیون رام نے اپنی غلطی تسلیم کر لی اور گاؤں کے باہر کے ایسے عناصر سے تعلق ختم کرنے کا وعدہ کر لیا۔ اس طرح امجد علی کی دانائی اور کوشش سے ایک بڑا خطرہ ٹل گیا اور چند دنوں میں ہی وہی خوشگوار ماحول لوٹ آیا۔

گاؤں میں پہلے بسنت کا تہوار آیا اور پھر عید کی خوشیاں منائی گئیں۔ ہنسی خوشی کے ماحول کے چند مہینے اور گزر گئے۔ مگر اوم وتی کے من کی مراد پوری نہیں ہوئی۔ اس کے ارمانوں کی کھیتی تو ابھی تک سوکھی پڑی تھی۔ لیکن امید اور آس کا دیا تو کبھی نہیں بجھتا۔

ایک دن ڈھیلو اور جیتو اپنے کھیت پر، جو ایک دوسرے کے بالکل پاس تھے، کام کر کے اکٹھے لوٹ رہے تھے تو بات کرتے کرتے انہوں نے وہ راستہ پکڑ لیا جس سے ڈھیلو کا گھر پہلے آتا تھا۔ شام کا وقت تھا، سورج درختوں کی آڑ میں بہت نیچے چلا گیا تھا اور ہلکا اندھیرا اور خاموشی گاؤں کی گلیوں میں پھیل چکی تھی۔ جونہی جیتو اور ڈھیلو ڈھیلو کی گلی میں داخل ہوئے تو خاموشی کو چیرتی ہوئی ایک بلند آواز ان کے کانوں میں پڑی۔ ''دے اللہ کے نام پر۔ دے مولا کے نام پر۔''

انہوں نے نظریں اٹھا کر دیکھا۔ دو مسلمان فقیر ایک بڑی سی چادر پھیلائے اور اسے دونوں ہاتھوں سے چاروں کونوں سے پکڑے بھیک مانگ رہے تھے اور کسی کسی گھر میں سے عورتیں یا آدمی نکل کر کچھ پیسے چادر پر ڈال رہے تھے۔ اس گلی میں بھی بتیا کی اور گلیوں کی مانند ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کے گھر تھے۔ ڈھیلو بولا۔

''اس گاؤں میں یہ فقیر پہلے تو میں نے نہیں دیکھے۔ اور یہ کوئی مانگنے کا وقت ہے؟''

''ڈھیلو مانگنے کا بھی کوئی وقت ہوتا ہے کیا؟ آس پاس کے گاؤں کے فقیر بھی ہمارے یہاں آ جاتے ہیں۔ پیٹ کی آگ بڑی بری چیز ہوتی ہے۔'' جیتو نے کہا۔

یہ کہہ کر جیتو دوسری گلی میں اپنے گھر کی طرف بڑھ گیا اور ڈھیلو تیزی سے قدم

بڑھاتا ہوا اپنے گھر میں گھس گیا اور سیدھا گھر پر لگے ہوئے ہینڈ پمپ پر نہانے کے لیے بالٹی بھرنے لگا۔ اس کی بوڑھی ماں اوم وتی نے بھی گلی میں ان فقیروں کی مسلسل آوازیں سن لی تھیں۔ وہ اوپر بنے اپنے کمرے میں تھی اور فقیر اب اُس کے گھر کے عین آگے اپنی آوازیں پوری طاقت سے لگا رہے تھے۔ اوم وتی نے اپنا ڈبہ کھول کر اس میں سے دو اٹھنیاں نکال کر چھت کی منڈیر سے ہی جھک کر چادر پر ڈال دیں۔ فقیروں نے نظر اٹھا کر کہا۔ ''ماں اللہ بھلا کرے گا۔''

''ٹھہرو'' اوم وتی نے اوپر سے ہی کہا اور تیزی سے نیچے اتر آئی۔ اس کے ہاتھ میں ایک پوٹلی تھی جس میں بھنے ہوئے چنے اور گڑ تھا۔ انہیں پوٹلی دیتے ہوئے اوم وتی ہاتھ جوڑ کر بولی۔

''سنت سائیں اس بڑھیا کی بھی سن لو۔ میری بہورامی کو بیاہی آئے آٹھ سال ہو گئے ہیں مگر سنتان کا منہ دیکھنا نصیب نہیں ہوا۔ بڑے جتن کیے سائیں اور علاج میں بھی کسر نہیں چھوڑی مگر کچھ نہیں ہوا۔ میں بڑھیا یہی آس لیے بیٹھی ہوں۔ سنتو کچھ اپکار کرو۔''

دونوں نے حیران ہو کر اوم وتی کی طرف دیکھا جو پلّے سے اپنے آنسو پونچھ رہی تھی۔ اُن کے دل رحم سے بھر گئے۔ اُن میں سے ایک بولا۔

''مائی ہم کوئی سنت سائیں یا پہنچے ہوئے فقیر نہیں ہیں۔ ہم تو پیٹ کی خاطر جگہ جگہ، گاؤں گاؤں پھرتے ہیں اور بھیک مانگتے ہیں۔ ہاں اس عمل میں اللہ کا نام اس کھوٹی زبان سے ہزاروں بار دن میں لیا جاتا ہے۔ ہم تو دعا ہی کر سکتے ہیں کہ اللہ تمہاری مراد پوری کرے۔''

''آمین'' دوسرا فقیر بولا ''مائی ایسا کرو تم بہو کو ساتھ لے جا کر بونے میاں کے مزار پر سنتھل ہو آؤ۔ ایک چادر اور چڑھاوا لے جانا۔ وہاں مانگی ہوئی منت پوری ہو جاتی ہے۔ یہاں سے صرف پچیس کوس ہے اور بس جاتی ہے۔ سینکڑوں ہندو اور مسلمان وہاں زیارت اور دعا کے لیے جاتے ہیں۔''

''یہ مائی بے چاری وہاں کہاں جائے گی'' پہلا فقیر بولا ''یہ میرے پاس درگاہ سے ہی لیا ہوا ایک تعویز ہے۔ اسے بہو کی بانہہ پر باندھ دینا۔ تعویز کے اندر بس ایک چھوٹا سا کاغذ ہے جس پر لکھا ہوا ہے ''ایشور، اللہ تیرو نام۔'' ہاں درگاہ کا تقدس اور دعا بھی اس میں شامل ہے۔ ایشور، اللہ رحیم و کریم ہیں اور اپنے ماننے والوں اور بھگتوں کو مایوس نہیں کرتے۔''

اوم وتی نے دونوں ہاتھوں میں تعویذ لیا اور پوچھا۔

''سائیں پھر کب پھیرا لگاؤ گے؟''

اس نے آگے بڑھتے ہوئے جواب دیا۔'' کچھ نہیں کہہ سکتے۔ آنے کو ایک دو مہینے میں پھر آ جائیں۔ نہ چکر لگے تو سالوں گزر جائیں۔ سب کچھ اللہ کی مرضی پر ہے۔''

اوم وتی نے گھر کے اندر آ کر پہلا کام یہ کیا کہ دیوار پر لگی ہنومان کی تصویر کے آگے پوجا کی اور پھر تعویز کو بہو کی بانہہ پر باندھ دیا۔

رامی کو تعویز باندھے اور اوم وتی کو ہر روز پوجا کرتے دو تین مہینے گزر گئے مگر کسی کے دل کی کلی نہیں کھلی حتی کہ موسم بہار آ گیا اور کھیتوں میں سرسوں کے پیلے پھولوں کی چادریں بچھ گئیں۔ اوم وتی کے گھر کے آنگن میں لگے آم کے پیڑ پر خوب بور آیا اور وہ چھوٹا سا امرود کا درخت تو کچے امرودوں سے لد گیا۔ چڑیوں اور کوؤں کا بھی آنگن میں آنا جانا شروع ہو گیا اور چڑیوں نے تو گھر میں دو جگہ دروازے کی چوکھٹ کے اوپر بنے آلوں میں گھونسلے بھی بنا لیے۔ ایک روز اوم وتی نے دیکھا کہ چڑیا کا ایک نوزائیدہ بچہ گھونسلے سے گر کر دہلیز میں پڑا تھا اور چڑیا پریشانی کے عالم میں اوپر سے چیخ رہی تھی۔ اس نے بہو کو آواز دی، بچے کو احتیاط سے نرم کپڑے سے اٹھا کر ایک گتے پر رکھ دیا اور چارپائی کو کھسکا کر اور اس پر بہو کو کھڑا کر کے بچے کو گھونسلے میں رکھوا دیا۔ مگر نہ جانے چڑیا کے بچے کو بھی دیکھ کر اس کی اپنی مایوسی کیوں گہری ہو گئی اور وہ ایک آہ بھر کر اپنی کھٹیا پر لیٹ گئی۔ تعویز تو رامی کی بانہہ پر ابھی تک بندھا تھا۔

آج بتیا میں صبح سے ہی بارش ہو رہی تھی۔ پہلے تو صرف بوندا باندی تھی اور ایسے میں ڈھیلو بوری اوڑھ کر اپنے کھیت پر کام کرنے نکل گیا تھا مگر بعد میں بارش تیز ہو گئی تھی۔ رامی روٹی صبح بنا لیتی تھی کیونکہ ڈھیلو کھیت پر جانے سے پہلے کھا بھی لیتا تھا اور دوپہر کو کھانے کے لیے لے بھی جاتا تھا۔ اس وقت رامی اور اس کی ساس روٹی کھا کر نیچے کے کمرے میں بیٹھی تھیں اور بارش کے رکنے کی منتظر تھیں۔ تھوڑی دیر میں بارش بالکل بند ہو گئی اور چمکیلی تیز دھوپ بادلوں کی اوٹ میں سے نکل آئی۔ رامی آنگن میں پڑے برتن مانجھنے کے لیے اٹھ گئی اور اوم وتی بھی باہر آ کر پیڑھے پر اس کے پاس بیٹھ گئی۔

برتن مانجھتے مانجھتے اچانک رامی نے سر درد کی شکایت کی اور ایک دو منٹ سر پکڑے بیٹھی رہی۔ پھر یہ کہہ کر کہ ماں جی دل گھبرا رہا ہے اٹھ کر اپنے کمرے کی طرف

جانے لگی مگر راستے ہی میں موری پر بیٹھ کر الٹیاں کرنے لگی۔ اوم وتی پریشان سی ہوگئی اور اس نے اُٹھ کر رامی کی پیٹھ تھپتھپائی اور اسے سہارے سے چارپائی پر لٹا کر بولی۔

''گھبرا مت بہو۔ میں حکیم جی سے ابھی دوا لائی۔ تو نے جو کل نمک لگا کر کچی امبیاں کھائی تھیں ان سے ہی کچھ گڑبڑ ہوئی ہے۔''

یہ کہہ کر اور چدّر اوڑھ کر اوم وتی گھر سے نکل گئی مگر باہر نکلتے ہی وہ سوچنے لگی کہ کہیں یہ وہ معاملہ تو نہیں ہے۔ اس نے حکیم صاحب کی بجائے رمضانی دائی کو بلانے کا فیصلہ کیا۔ وہ بہت تجربے کار اور ہوشیار تھی اور عورتوں کی چھوٹی موٹی بیماریوں کا علاج تو وہ خود بھی کر دیتی تھی۔ رمضانی گھر پر ہی تھی اور وہ اوم وتی کے ساتھ ہی چلی آئی۔ کمرے میں گھستے ہی وہ بولی۔

''ماں جی ذرا آپ باہر بیٹھ جائیں۔ میں بہو کو دیکھ لوں''

کوئی پانچ منٹ کے بعد وہ ہنستی ہوئی باہر نکلی اور اوم وتی سے بولی۔

''ماں جی مبارک ہو۔ بہو کا پاؤں بھاری ہے۔ نواں سال ہے بہو کو آئے۔ کوئی چمتکار ہوا ہے۔ اللہ سب کی سنتا ہے۔ لو میں چلتی ہوں۔''

''ٹھہرنا۔ منہ تو میٹھا کرتی جا۔ اللہ ایشور نے میری سن لی۔ تھوڑا سا گڑ اور بتاشے رکھے ہیں، وہ لے جا۔''

رمضانی بولی۔

''کچھ پیسے ہوں تو وہ بھی لے آنا۔ شگن ہوتا ہے۔ چار آٹھ آنے ہی سہی۔''

اوم وتی گڑ اور بتاشے لے آئی اور اپنے پلّو کو کھول کر ایک دو روپے کا شکن آلود نوٹ بھی اسے تھما دیا۔ رمضانی دعائیں دیتی ہوئی اور یہ کہہ کر کہ وہ ہر دسویں پندرہویں دن آ کر بہو کو دیکھ لے گی، چلی گئی۔

خوشی کے مارے اوم وتی نہیں جانتی تھی کہ وہ کیا کرے۔ وہ کمرے میں گئی اور بے اختیار بہو کی بلائیں لینے لگی۔ پھر ٹھٹکا کر اُس نے بہو کا بازو دیکھا۔ ہاں وہ محافظ تعویز تو ابھی تک وہاں بندھا تھا!

کب تک ایسا ہوگا؟

پھر وہی کشیدگی، وہی تناؤ! وہی محلوں کی تنگ، ٹیڑھی میڑھی گلیوں میں مردوں کا چھپ چھپا کر اکٹھے ہونا اور حملے اور مدافعت کے منصوبے بنانا۔ کل کے دنگے فساد کے بعد جو صرف ان دو ملحق محلوں تک محدود تھا، احتیاط کے طور پر سارے شہر میں کرفیو لگا دیا گیا تھا۔ مگر ان دو محلوں میں تو موت کا سا سناٹا تھا۔ کچھ مرد دو دو چار کی ٹولیوں میں گھروں کے باہر نکل کر گلی میں یا سڑک پر آ بھی جاتے، مگر گشت لگاتی ہوئی پولیس کو دیکھتے ہی رفو چکر ہو جاتے۔

یا اللہ کچھ بھی تو نہیں بدلا تھا! خون آلود آزادی کو ملے اور ملک کے بٹوارے کو ہوئے نصف صدی سے زیادہ عرصہ سرسراتا ہوا اوپر سے گزر گیا تھا مگر جیسے خوف کی کوئی دبیز چادر تھی جو سرکنے کا نام ہی نہیں لیتی تھی۔ جانے وہ کون سا جنون تھا جو وقفے وقفے کے بعد ہمارے اندر اپنا سر اٹھاتا تھا اور ہم یہ بھول جاتے تھے کہ جن لوگوں پر ہم قاتلانہ حملہ کر رہے ہیں، اور جن کے مکانوں اور دکانوں کو نذرِ آتش کر رہے ہیں وہ ہمارے ہم وطن، پڑوسی اور بھائی ہیں، کوئی غیر نہیں۔ پچھتر سالہ یعقوب جو ہندوستانی فوج سے چالیس سال قبل پیش از وقت ریٹائر ہو گیا تھا، اپنے بوسیدہ مکان کی وسیع ڈیوڑھی میں چارپائی پر بیٹھا ہوا خوفزدہ سا ہو کر سوچ رہا تھا۔

آج دوسرا دن تھا کہ اس کا یار ڈی رام بھروسے بھی نہیں آیا تھا اور انہوں نے کوڑیاں نہیں کھیلی تھیں۔ یہ ان کا پرانا شغل تھا اور بڑھاپے اور کام کے بغیر خالی پن میں

دو تین گھنٹے کٹ جاتے تھے۔ مگر رام بھروسے آتا بھی کیسے۔ کیا اسے اپنی جان سے ہاتھ دھونا تھا۔ جان تو ناکارہ بوڑھوں کو بھی عزیز ہوتی ہے۔ اسی لیے تو یعقوب بھی کل سے دروازے کے باہر بھی نہیں جھانکا تھا۔ بے آئی موت کون مرے۔ ہم وطن بھی خون کے پیاسے اور یہاں کی پولیس بھی دیوانی، گولی چلانے اور لاٹھیوں سے وار کرنے کا بہانہ ڈھونڈتی ہوئی۔

فساد صرف اسی شہر یعنی دھامپور میں ہوا تھا اور محلّہ کیدارہ اور اقبال گنج میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی دکانوں اور مکانوں کو جلا دیا گیا تھا۔ دونوں محلوں میں دو تین آدمی بھی مارے گئے تھے۔ یہ سب کچھ ہوا تھا افواہوں کی بنا پر، جن کا دور کا تعلق بھی دھام پور سے نہیں تھا۔ دھام پور تو اتنا بڑا شہر بھی نہیں تھا کہ ہر اثر کو قبول کرے۔

یعقوب بیٹھا بیٹھا تیس چالیس سال پہلے کے دھام پور کے بارے میں سوچنے لگا۔ کوئی پچیس تیس ہزار کی آبادی کا گمنام سا شہر۔ تین چار محلے تھے اور ہر محلے میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی تقریباً یکساں آبادی اور ہر روز کا میل جول۔ لوگ عام طور پر غریب اور کاشتکار تھے اور آبادی کا ایک بڑا اٹکڑا مزدوری یا مرمت وغیرہ کا کام کر کے گزارہ کرتا تھا۔ صرف ایک مسجد اور ایک مندر تھا جن کے بیچ کا فاصلہ مشکل سے سو گز ہوگا۔ مگر خستہ حال مندر بھی تھا اور مسجد بھی۔ لوگ غریب تھے اور عالیشان مسجد اور مندر کون بنواتا۔ شاید غربت اور تعلیم کی نمایاں طور پر کمی کے سبب ہندوؤں اور مسلمانوں میں بڑا میل جول تھا۔ ان دنوں کو یاد کر کے یعقوب کی بوڑھی آنکھیں بھی بے اختیار بھیگ گئیں۔

تو کیا یہ ترقی، یہ آگہی، یہ تعلیم، یعقوب کی سوچ نے ایک کروٹ لی، ہمیں اتنا مذہبی بنا دیتی ہیں کہ ہم جنون کی حد کو بھی پار کر جائیں اور ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو جائیں؟ صدیوں کے ساتھ اور ہمسائیگی کو یوں فراموش کر جائیں؟ اور پھر اس ملک کے ہندو اور مسلمان، عام اور غریب آدمی، اپنے دھرم اور مذہب کو کتنا جانتے ہیں اور اس کی تعلیمات پر کتنا عمل کرتے ہیں، یہ سوچ کر حولدار یعقوب مغموم سا ہو گیا۔

کبھی محلّہ کیدارہ اور اقبال گنج میں ہندو اور مسلمان مل کر رہتے تھے اور آبادی کا تناسب برابر کا سا تھا۔ یہی حال دکانوں کا تھا، مگر جب جب کسی فتنہ یا فساد نے سر اٹھایا تو یہ تناسب بتدریج کم ہوتا گیا اور آج محلّہ کیدارہ میں پچانوے فیصدی ہندو اور اقبال گنج میں اس سے بھی کچھ زیادہ مسلمان رہتے تھے۔ مگر کام اور کاروبار کے سلسلے میں دونوں ہندوؤں

اور مسلمانوں کا ایک دوسرے کے محلے میں آنا جانا لگا رہتا تھا۔

جہاں تک دھام پور میں ہوئے فساد کا تعلق تھا اس کے لیے دو افواہیں ذمہ دار تھیں۔ ایک تو یہ کہ یہاں سے پانچ سو کلومیٹر دور ایک بڑے شہر میں قرآن شریف کے چند جلے ہوئے صفحات سڑک پر پڑے ہوئے ملے تھے اور دوسری یہ کہ کسی اور شہر میں گنیش کی مورتی کیچڑ اور گندگی میں لپٹی ہوئی نالی میں پڑی پائی گئی تھی۔

یعقوب کے تین بیٹے اور چار بیٹیاں تھیں۔ سب شادی شدہ اور بچوں والے۔ بیٹیاں نزدیک کے دیہات میں بیاہی گئی تھیں۔ تینوں بیٹے یہیں اس کے پاس تھے یعنی وہ ان کے پاس رہتا تھا اور بہوؤں اور پوتے پوتیوں کے ساتھ یہ ایک بھرا پرا گھر تھا۔ دو پوتیوں کی شادی ہو چکی تھی۔ گزارے لائق زمین تھی اور بیٹے اور بہویں کھیتوں پر کام کرتی تھیں۔ اس کی پنشن اگرچہ تھوڑی تھی مگر ہر مہینے مل جاتی تھی اور بڑا سہارا تھی۔ اس کی بیوی پانچ سال ہوئے داغِ مفارقت دے گئی تھی اور جب سے وہ خود کو بڑا تنہا بلکہ بے سہارا سا محسوس کر رہا تھا۔ وہ اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ آدمی اور عورت کا ہی سب سے بڑا رشتہ تھا اور بڑھاپے میں تو یہ سب سے افضل رفاقت تھی۔ شکر تھا کہ کچھ پرانے ہمدم اور ساتھی ابھی باقی تھے اور وہ ہر روز اس کے یہاں آ کر کوڑی کھیلتے اور باتیں کرتے تھے۔ مگر دو دن کے اس دنگے فساد میں نہ فتّے آیا تھا، نہ اسلم اور نہ رام بھروسے۔ اس نے نیچے پڑی کوڑیوں کی بند تھیلی اور دیوار کے سہارے کھڑے تختے کو دیکھا اور ہوک سی دل میں اٹھ گئی۔ ڈیوڑھی کی دھوپ سمٹنے لگی تھی اور وہ اٹھ کر اندر اپنے کمرے میں جانے کی سوچنے لگا کہ اس کا سب سے بڑا بیٹا احمد باہر سے اندر آیا اور بولا:

''ابھی ابھی ریڈیو پر خبر سنی ہے کہ دھام پور سے کرفیو ہٹا لیا گیا ہے۔ ہمارے ادھر دکانیں بھی کھل گئی ہیں اور لوگوں کا آنا جانا شروع ہو گیا ہے۔''

''شکر ہے اللہ کا'' یعقوب بولا۔

''مگر آپ یہ خبر سنتے ہی باہر نہ نکل جانا محمد و اور مختار کی خبر ہے کہ ہندو رات کو پھر حملہ کرنے کی سوچ رہے ہیں۔ ہندو نہ کبھی ہمارے ہوئے ہیں، نہ ہوں گے۔ بہتر ہے کہ آپ بھی چچا رام بھروسے کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا چھوڑ دیں۔ ان کے سارے لڑکے مسلمانوں کے دشمن ہیں۔ مسلمانوں کی جو دکانیں جلی ہیں، اس گروہ میں وہ بھی شامل

تھے۔ محمدو نے مجھے بتایا ہے۔''

یعقوب یہ سن کر ہکا بکا رہ گیا۔ بلکہ اس کے دل کو بڑا دھکا پہنچا اور یہ اس کا اپنا بیٹا احمد اس کے سامنے بول رہا تھا جو بچپن میں رام بھروسے کی گودی سے اتارے نہیں اترتا تھا اور جب ذرا بڑا ہوا تو رام بھروسے کے بیٹوں کے بغیر ایک منٹ نہیں رہتا تھا اور کئی دفعہ رات کو رام بھروسے کے گھر دیر تک کھیلتا رہتا تو وہیں روٹی کھا کر سو جاتا اور ممتا کی ماری اس کی والدہ ہی اسے جا کر اٹھا لاتی۔ بلا شبہ وہ دن وہ تھے جب اقبال گنج کی ہر گلی میں ہندوؤں کے مکان بھی تھے اور رام بھروسے کا گھر ان کی ہی گلی میں ان کے گھر سے صرف ایک گھر چھوڑ کر تھا۔ یعقوب کو احمد کی بات پر غصہ تو بہت آیا مگر دل پر جبر کر کے بغیر کچھ کہے اندر چلا گیا۔ اس زمانے میں اولاد کے سامنے بھی بے بس بوڑھوں کا خاموش رہنا ہی دانش مندی تھی۔

اگلے روز سارے دھام پور میں وہی چہل پہل تھی جو ہر روز ہوتی تھی۔ وہی آمد ورفت اور وہی سب کچھ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔ دو دن سے یعقوب کا اردو کا اخبار بھی نہیں آیا تھا، مگر آج بارہ بجے اخبار والا اخبار بھی ڈال گیا۔ اخبار چوں کہ لکھنؤ سے چھپتا تھا یہاں دھام پور میں دیر سے پہنچتا تھا۔ یعقوب نے اخبار اٹھایا اور چارپائی پر بیٹھ کر اور عینک لگا کر پڑھنے لگا۔ ایک اہم خبر جو اس نے سب سے پہلے پڑھی وہ تفتیش کے بعد سرکار کی طرف سے ان افواہوں کی تردید یا وضاحت تھی جن کے بنا پر کہیں کہیں یہ فساد ہوئے تھے۔ جلے ہوئے صفحات قرآن شریف کے نہیں عربی کی کسی تاریخی کتاب کے تھے۔ ہندوؤں کے دیوی دیوتا تو کھلونوں کی صورت میں عام ملتے ہیں۔ وہ گنیش کا ایک بڑا مٹی کا کھلونا تھا جسے ٹوٹ جانے پر باہر پھینک دیا گیا تھا۔

یعقوب نے اخبار کو لپیٹ کر اپنے تکیے کے نیچے رکھ دیا اور کچھ سوچتا ہوا پہلے دروازے میں اور پھر باہر گلی میں آ کر کھڑا ہو گیا۔ مولوی شبیّر احمد کے مکان میں جو پتائی اور سفیدی چل رہی تھی وہ آج پھر شروع ہو گئی تھی اور یہ دونوں سفیدی کرنے والے ہندو تھے۔ اقبال گنج کے پچاسوں مسلمان کاریگر بھی اسی طرح محلّہ کیدارہ میں ہندوؤں کے گھروں میں کام کر رہے ہوں گے۔ ہر روز مسلمانوں کی دکانوں سے ہندوؤں کا سامان خریدنا اور ہندوؤں کی دکانوں سے مسلمانوں کی خرید و فروخت ایک عام بات تھی۔ پھر چشم زدن میں کیا ہو جاتا ہے اور کون یہ آگ لگا جاتا ہے کہ وہ صدیوں پرانا بھروسہ یوں کانچ کی طرح ٹوٹ کر

بکھر جاتا ہے، یعقوب سوچتا ہوا اندر آ بیٹھا۔

چار بجنے سے کچھ پہلے ہی، سہ پہر کی ایک گھنٹے کی نیند کے بعد یعقوب نے اپنی چار پائی سے اتر کر اور پرانی دری کو نیچے بچھا کر اور تختے کو دیوار کے سہارے ٹیڑھا لگا کر اور تھیلی سے کوڑیاں نکال کر دروازے کی طرف جھانکنا شروع کر دیا۔ اگر چہ اس کے بیٹوں نے آج صبح بھی اسے بتایا تھا کہ شہر میں تناؤ ابھی بنا ہوا ہے، اسے یقین تھا کہ فتّے، اسلم اور رام بھروسے آج ضرور آئیں گے۔ اور واقعی عین اُسی وقت فتّے اور اسلم اکٹھے ہی اس کی ڈیوڑھی میں داخل ہوئے۔ اور سلام علیکم کہنے کے بعد دری پر بیٹھ گئے۔ فتّے نے پوچھا۔

''رام بھروسے نہیں آیا؟''

''نہیں'' یعقوب نے دروازے میں سے گلی کی طرف جھانکتے ہوئے کہا۔

دو تین منٹ تک تینوں خاموش بیٹھے رہے۔ یعقوب کوڑیاں ہتھیلیوں میں لیے یونہی مسلتا رہا۔ رفاقت کا جذبہ بھی بڑا عجیب ہوتا ہے۔ ایک بھی رفیق موجود نہ ہو تو دل نہیں لگتا۔ اسلم اٹھتے ہوئے بولا۔

''چل فتّے میں اور تم جا کر اسے لے آتے ہیں۔ دور ہی کتنا ہے۔ چھوٹے بازار کو پار کیا اور اس کا گھر آ گیا۔ یعقوب تم یہیں ٹھہرو۔''

''نہیں میں بھی چلتا ہوں'' یعقوب اٹھتے ہوئے بولا۔ ''طبیعت ٹھیک نہیں ہو گی ورنہ وہ رکنے والا کہاں ہے۔''

تینوں نے اپنی اپنی جوتی پہنی۔ یعقوب نے ٹوپی سر پر رکھی، چشمہ لگایا، اپنی چھڑی اٹھائی اور زور سے آواز لگاتا ہوا کہ 'ابھی آیا' اسلم اور فتّے کے ساتھ باہر نکل آیا۔

اُدھر رام بھروسے کی طبیعت تو کچھ خراب تھی، مگر اتنی بھی نہیں کہ وہ یعقوب کے یہاں نہ جا سکے اور کوڑیاں نہ کھیلے۔ مگر اس کے بیٹے راج نے اسے ڈرا دیا تھا کہ ایک دو دن باہر نہ نکلیں۔ مگر راج چار بجے کے بعد باہر نکلا تو اس نے بھی سوچا کہ وہ یعقوب کے ہاں ہو آئے۔ تیار ہوا، ٹوپی سر پر رکھی اور بہو کو یہ کہتا ہوا کہ اقبال گنج تک جا رہا ہوں، گھر سے نکل پڑا۔ اقبال گنج میں داخل ہونے ہی والا تھا کہ پیچھے سے راج کی آواز آئی اور وہ رک گیا۔ راج اور اس کا دوست ہرلیش بھاگے ہوئے آ رہے تھے، مگر ان کے ہاتھوں میں لاٹھیاں دیکھ کر وہ پریشان سا ہو گیا۔ راج بولا۔

''باپو میں نے منع کیا تھا مگر تم نہ مانے۔ کیا مسلمانوں کے محلے میں مسلمانوں کے ہاتھوں مرنے کا اتنا شوق ہے؟ میں کب سے کہہ رہا ہوں کہ مسلمان اعتبار کے قابل نہیں اور چاچا یعقوب بھی تمہیں دھوکا دیں گے مگر تم کسی کی سنتے ہی نہیں۔ چلو واپس۔''

''مگر سب کچھ ٹھیک ہو گیا ہے بیٹے۔ آنا جانا تو کل سے ہی شروع ہو گیا تھا۔'' رام بھروسے بولا۔

''چاچا جی راج ٹھیک کہتا ہے'' ہریش بولا ''آپ لوٹ چلیے۔''

مگر اسی وقت صرف چند قدم کے فاصلے پر اقبال گنج سے آتے ہوئے اسلم، فتے اور یعقوب کو رام بھروسے نے دیکھ لیا تھا اور وہ ہریش کی بات کو ان سنی کر کے وہیں کھڑا ہو گیا۔ ان تینوں کے پیچھے بھی بھاگتا ہوا یعقوب کا بیٹا احمد چلا آیا تھا اور لاٹھی اس کے ہاتھ میں بھی تھی۔ اس کا دوست محمد و بھی اس کے ساتھ تھا، مگر اس کے ہاتھ میں لاٹھی نہیں تھی۔ احمد یعقوب کو روک کر بولا۔

''ابا تم میرے منع کرنے پر بھی چچا رام بھروسے سے ملنے یہاں ہندوؤں کے محلے میں چلے آئے اور ساتھ ہی چچا اسلم اور فتے کو بھی لے آئے؟ اپنے ساتھ دو مسلمانوں کو مروانے کا تمہیں کوئی حق نہیں۔ اور تم اپنی جان کے دشمن کیوں ہو رہے ہو۔ ہندو بھی کسی کا ہوا ہے۔ چلو واپس۔''

یہ بات رام بھروسے، اس کے بیٹے راج اور ہریش نے بھی سن لی تھی کیوں کہ رام بھروسے یعقوب کو دیکھتے ہی ادھر بڑھ آیا تھا اور اب وہ سب آمنے سامنے کھڑے ایک ہی بھیڑ کا حصہ تھے۔ چوں کہ اس بھیڑ میں تین آدمی لاٹھیاں بھی لیے ہوئے تھے، دو تین ہندو اور اتنے ہی مسلمان راہ چلتے کھڑے ہو گئے تھے۔

راج اور ہریش کے ہاتھوں میں لاٹھی دیکھ کر احمد نے بھی لاٹھی اٹھا لی تھی۔ محمد و بھی اپنے دوست کے ساتھ مقابلے کے لیے سینہ تان کر کھڑا ہو گیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں لاٹھی نہ سہی مگر وہ بڑا طاقتور تھا اور مخالف کی لاٹھی چھین کر اسے دھول چٹا سکتا تھا۔ یہ چاروں ایک دوسرے کو خونخوار آنکھوں سے دیکھنے لگے۔ مگر رفاقت اور مدتوں کے میل جول کے جذبے کا طاقتور ریلا یعقوب اور رام بھروسے کے سینوں میں اچانک بے قابو ہو کر پوری شدت سے پھوٹ پڑا اور وہ اپنے بچوں کی خطرناک مخالفت کی پرواہ نہ کرتے ہوئے ایک دوسرے کی

طرف بڑھ کر بغل گیر ہو گئے اور پھر یہ چاروں دوست باہر نکل کر یعقوب کے گھر کی طرف مڑ گئے، جہاں دوستی اور رشتے کو استوار کرنے والی بے جان کوڑیاں ان کی منتظر تھیں۔ لاٹھیاں اٹھی کی اٹھی رہ گئیں اور خونخوار آنکھیں خلا میں تاکتی رہیں۔ شاید ابھی اولادوں کا خون اتنا سرد نہیں ہوا تھا کہ مشتعل ہو کر اپنے اباؤں اور چچاؤں پر بھی وار کر دیں۔

اتنے میں ایک پولیس والا اس چھوٹی سی بھیڑ کو دیکھ کر اپنی لاٹھی گھماتا ہوا ادھر لپک پڑا تھا اور اسے دیکھتے ہی یہ بھیڑ بھی تتر بتر ہو گئی۔

مگر یعقوب اپنے دوستوں کے ہمراہ جاتے ہوئے یہ سوچ رہا تھا کہ کب تک ایسا ہوگا۔ کب تک اپنے ہی وطن میں لوگ شک، تعصب اور نفرت کے سائے میں جئیں گے۔ کب تک ہم اپنے عظیم مذاہب کی تعلیمات کو صحیح طور پر سمجھ نہیں پائیں گے، کب تک؟۔

⩓ ⩓ ⩓

مولا کی نگری

وہ تینوں بیک وقت مگر الگ الگ اور ایک دوسرے سے کافی فاصلے پر، گھپ اندھیرے میں ایک بے پایاں بلندی سے ایک بے اندازہ نشیب میں، تیر کی طرح سیدھے مگر بے حس وحرکت اتر رہے تھے کہ اچانک ان کے قدم زمین کی طرح کسی سخت شے سے چھوکر رُک گئے اور وہ انتہائی سراسیمگی اور خوف کے عالم میں اپنے گردو پیش دیکھنے لگے۔ پھر اچانک اندھیرا کافور ہو گیا اور ایک خوشگوار اور ٹھنڈا اجالا چاروں طرف پھیل گیا، اگر چہ سورج کا نام ونشان نہیں تھا اور آسمان کی جگہ ایک باریک نور کی چادر تنگی ہوئی تھی۔ وہ ایک دوسرے کی نظروں سے اوجھل اور قطعی بے گانہ کسی انجان، وسیع اور عریض زمین پر کھڑے تھے۔ انہوں نے سب سے پہلے اپنے جسموں کو ٹٹولا اور یہ جان کر مطمئن ہو گئے کہ جسم بھی صحیح وسالم تھا اور ہوش وحواس بھی قائم تھے۔ ان تینوں کے نام تھے گوردیو سنگھ جو پنجاب کا سکھ تھا، رام لبھایا جو اتر پردیش میں ضلع گونڈہ کے ایک گاؤں کا ہندو کاشتکار تھا اور ڈیوڈ جو کرناٹک کے ایک چھوٹے سے قصبے کے گرجے کا پادری اور عیسائی مبلّغ تھا۔ ان تینوں کی موت اچھی خاصی عمر میں قدرتی طور پر اپنے اپنے گاؤں اور شہر میں ہوئی تھی اور انہیں موت کے بعد کی زندگی کا کسی اور انسان کی مانند کوئی احساس اور علم نہیں تھا۔ ہاں، اپنی زندگی کے آخری چند سالوں میں، بغیر یہ جانے کہ ان کی موت ہونے والی ہے۔ انہوں نے اپنے اپنے دھرم، مذہب اور عقیدے کے مطابق

پوجا پاٹھ اور عبادت تیز کردی تھی اور کچھ زیادہ نیک بن گئے تھے۔ ایسا انہوں نے ایک انجانے ڈر اور خوف سے کیا تھا۔ ویسے بھی اس دھرتی پر پیدا ہونے والا کوئی بھی انسان ایسا نہیں ہے جس سے کوئی گناہ نہ سرزد ہوا ہو!

ہاں ٹھہریئے، موت تو اللہ بخش کپڑے والے کی بھی احمد آباد میں بڑی عمر میں، ہی اسی وقت اور اسی دن ہوئی تھی اور اس نے بھی وہ سب کچھ کیا تھا جو ان تینوں نے کیا تھا مگر وہ ان کی طرح جسم اور ذہن سمیت بلندی سے کسی انجانی دھرتی پر نہیں اترا اور اترا بھی ہو تو اس کا ذکر کرنا مناسب نہیں کیونکہ اللہ بخش کے مذہبی عقیدے کے مطابق تو مردے قیامت کے دن ہی اٹھیں گے۔ اس لیے اللہ بخش کی بات یہاں نہیں کرتے ہیں۔ مگر ایسا بھی نہیں ہے کہ ہم اپنی بات کہنے میں اسے بھول جائیں گے۔

یہ تینوں یعنی گورو دیو سنگھ، رام لبھایا اور ڈیوڈ بھونچکے سے ایک انجانی دھرتی پر اپنی اپنی جگہ پر کھڑے تھے، تنہا تنہا سے اور بار بار اپنے جسم اور کپڑوں کو چھو رہے تھے کیونکہ انہیں اپنے وجود کے بارے میں شک تھا۔ تعجب کی بات یہ تھی کہ انہیں یہ احساس بھی نہیں تھا کہ وہ اپنی دنیا میں مر چکے تھے۔ وہ وہی کپڑے پہنے ہوئے تھے جو وہ عموماً اپنی سرزمین پر پہنتے تھے۔ نہ ہی اپنے پیچھے چھوڑے ہوئے انہیں اپنے گھروں اور رشتے داروں کا احساس تھا جو ان کے غم میں رو رو کر پاگل ہو گئے تھے۔ حالانکہ اپنی دھرتی پر وہ صبح اٹھتے ہی چائے یا کافی پیتے تھے لیکن اگر اس وقت واقعی صبح تھی تو انہیں اس ضرورت کا احساس بھی یہاں نہیں ہوا تھا۔ شاید اس دھرتی پر وہ اپنی روزانہ ضروریات اور دیگر معمولات سے غافل تھے اور بھوک پیاس کا بھی انہیں کوئی احساس نہیں تھا۔ سب سے پہلے گورو دیو سنگھ نے پہل کی۔ یہ دھرتی سپاٹ اور وسیع تھی۔ موسم خوشگوار تھا۔ بغیر دریافت کیے پتہ کیسے لگے گا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے قدم اٹھائے۔ ہاں وہ چل سکتا تھا! وہ ایک سمت چلتا رہا اور اب اُسے یہ احساس ہوا کہ وہ چل نہیں رہا تھا بلکہ کسی کشتی پر سوار روانی اور تیزی سے دریا کو پار کر رہا تھا۔ مگر کوئی دریا، کوئی کشتی کہیں نہیں تھی۔ وہ اس نقطے پر پہنچ گیا جہاں ایک خوف و ہراس میں جکڑا ہوا رام لبھایا کھڑا تھا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو انتہائی حیرانی سے دیکھا اور پھر مسکرا کر ایک دوسرے سے بغل گیر ہو گئے۔ گورو دیو سنگھ بولا۔

''شکر ہے میرے جیسا کوئی تو ملا۔ یہاں کھڑے کھڑے کیا سوچ رہے تھے۔ چلو اس دنیا کو دیکھتے ہیں۔ ایسا خوشگوار موسم اور چاروں طرف پھیلی ہوئی ایسی خوشبو، میں نے اس سے پہلے نہیں دیکھی۔''

رام لبھایا ایک بے جان سی ہنسی ہنس دیا۔ وہ کچھ ڈرا ہوا تھا کہ جانے یہ اجنبی آدمی اسے کہاں لے جائے۔ مگر یہاں بھی کب تک کھڑا رہے گا اور یہی بات جب گورو دیوسنگھ نے اس سے کہی تو اسے کچھ حوصلہ ہوا اور دونوں ایک جانب چل دیئے۔ اسی طرح کشتی کی سی تیزی اور روانی سے۔ اس چلنے میں بڑا مزہ آرہا تھا اور انہیں یہ احساس بھی نہیں تھا کہ انہوں نے کتنا فاصلہ طے کرلیا تھا۔ اچانک اپنے سامنے وہ ایک تیسرے انسان کو دیکھ کر ٹھٹھک گئے۔ یہ ڈیوڈ تھا جو اس وقت بھی پادری کا لمبا سفید لباس پہنے ہوئے تھا اور اس کے گلے میں صلیب لٹکی ہوئی تھی۔ مگر حیران اور پریشان وہ بھی تھا اور قدرے خوفزدہ بھی۔ ان دونوں کو دیکھ کر بڑا خوش ہوا۔ تینوں پہلے گلے ملے اور جب علیحدہ ہوئے تو گورو دیو دسنگھ بولا۔

''میں پنجاب کا رہنے والا تھا۔ میرا نام گورو دیوسنگھ ہے۔ اب تم دونوں بھی اپنا نام بتادو۔ یہ نام بھی کیا چیز ہے۔ اس کے بغیر ہم انسانوں کی نہ کوئی ہستی ہے، نہ وجود۔''

''دوست'' رام لبھایا بولا ''جب ابھی تم مجھ سے ملے تھے، میں تمہارا نام پوچھنا چاہتا تھا مگر یوں چپ رہ گیا کہ مجھے اپنا نام ہی یاد نہیں رہا۔ اب کچھ کچھ یاد آرہا ہے۔ نام میرا رام لبھایا ہے۔ اتر پردیش کا ایک غریب کھیتی کرنے والا تھا۔''

''اور تم میرے دوست؟'' گورو دیوسنگھ ڈیوڈ کی طرف دیکھ کر بولا۔

''اس ناچیز کو ڈیوڈ کہتے ہیں۔ میں کرناٹک کے ایک چھوٹے سے قصبے میں گرجے کا پادری تھا۔ خدا کے بیٹے یسوع مسیح کا پجاری تھا۔ یہ دیکھو میری صلیب۔ مگر یہ ہم کہاں آگئے ہیں؟ اور ہم مردہ ہیں یا زندہ۔ لگتا ہے مر گئے ہیں۔''

ڈیوڈ کے اس سوال کا جواب نہ کسی کے پاس تھا اور نہ کسی نے دیا۔ شاید اس انجانی دھرتی پر ایسے سوالوں کی گنجائش نہیں تھی اور یا یہ بے معنی تھے۔

اس بات چیت کے بعد تینوں خاموش ہوگئے اور اپنے اردگرد کچھ ٹٹولنے لگے۔

انہوں نے پھر اپنے جسموں اور کپڑوں کو دیکھا اور ہاتھ سے محسوس کیا۔ جب وہ اپنی زمین پر تھے اور اپنے رشتے داروں، احباب اور دوسرے لوگوں کے درمیان ایک بھری پری زندگی جیتے تھے تو ایک منٹ کے لیے بھی یہ سوچ کر کہ وہ کبھی اس دنیا سے سب کچھ یہیں چھوڑ کر چلے جائیں گے بڑے پریشان اور اداس ہو جاتے تھے لیکن جانے موت کے بعد یہاں آ کر کیا ہوا کہ انہیں اپنے اُن رشتے داروں، احباب اور دوسرے لوگوں بلکہ اس دنیا کا بھی احساس تک نہیں تھا اور نہ ان سے بچھڑنے کا غم۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ کوشش کرنے پر بھی اپنے ذہن میں اُس چھوڑی ہوئی دنیا کے کسی بھی پہلو کی کوئی تصویر نہیں بنا سکے تھے۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ وہ یہاں آ کر ایسے سکون اور اطمینان کا احساس کر رہے تھے جو انہیں اپنی اُس دھرتی پر کبھی نہیں ملا تھا۔

''آیئے نیچے بیٹھ جاتے ہیں'' پادری ڈیوڈ بولا ''اگر چہ ٹانگوں میں تھکاوٹ بالکل نہیں ہے۔ مگر ہم لوگ بیٹھ کر اطمینان سے باتیں کرنے کے عادی ہیں۔''

''کیوں نہ ہم چلتے رہیں'' گورو دیو سنگھ بولا ''کہیں نہ کہیں تو پہنچیں گے، کوئی نہ کوئی تو ملے گا۔ مگر یہاں نہ کوئی سڑک ہے، نہ مکان، نہ پرندے، نہ جانور، نہ ہوا، نہ پانی اگر چہ ہوا اور پانی کی ہمیں ضرورت نہیں پڑی۔''

''میں حیران ہوں کہ ہم کہاں آ گئے'' رام لبھایا بولا ''اگر ہم لوگ مر گئے ہیں تو بھگوان کے درشن کب ہوں گے۔ ہمارا کیا بنے گا۔ کیا ہم یونہی چلتے اور بھٹکتے رہیں گے؟ سوئیں گے کہاں؟''

رام لبھایا اگر اپنی دھرتی پر ہوتا تو رو پڑتا مگر نہ وہ اداس ہوا اور نہ آنکھ میں کوئی آنسو آیا۔ پادری ڈیوڈ بولا۔

''مر تو ہم ضرور گئے ہیں یعنی وہ دنیا تو چھوٹ گئی ہے۔ چلو پھر بیٹھنا کیا ہے۔ کسی بھی سمت چل پڑتے ہیں۔ کچھ تو پتہ چلے گا۔ ورنہ ایسے خوشگوار موسم میں سیر ہی ہو جائے گی۔''

ڈیوڈ پادری نے ابھی یہ کہا ہی تھا اور وہ اپنے دونوں ساتھیوں کے آگے ایک رہنما کے طور پر کھڑا ہوا ہی تھا کہ سامنے سے ایک صاف شفاف غبار سے میں لپٹا ہوا ایک خضر صورت آدمی جس کی عمر کا اندازہ لگانا مشکل تھا ان کی طرف گیند کی طرح لڑھکتا ہوا نظر آیا اور

وہ کھڑے کے کھڑے رہ گئے۔ وہ آدمی ان کے سامنے آ گیا۔ مگر اب بھی اس کی عمر کا قیاس لگانا مشکل تھا۔ کبھی وہ کئی سو سال کا لگتا اور کبھی نوجوان۔ اس کی داڑھی اور بالوں کے رنگ بھی بدل رہے تھے۔ پادری ڈیوڈ نے انگریزی میں سوال کیا۔

''آپ کون ہیں۔ کیا یہ گاڈ اور اس کے بیٹے یسوع مسیح کی سلطنت ہے۔ آبادی کتنی دور ہے؟ چرچ کہاں ہوگا؟''

وہ آدمی پہلے تو ہنسا۔ پھر اُس نے انگریزی میں ہی جواب دیا۔

''میرے بیٹے یہ وہی دھرتی ہے جس کے بارے میں آپ پوچھ رہے ہیں۔ لیکن ٹھہرئیے بات اس زبان میں کرتے ہیں جسے آپ کے دونوں ساتھی یعنی گورو دیو سنگھ اور رام لبھایا بھی سمجھتے ہیں۔ ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ یہ گاڈ کی ہی دھرتی ہے مگر یہاں چرچ یعنی گرجا نہیں ہے۔''

''جناب'' گورو دیو سنگھ آگے بڑھ کر بے تابی سے بولا ''واہیگو رو یا اونکار تو ہوں گے؟ میں سکھ ہوں اور واہیگو رو کی شرن میں آیا ہوں۔ گوردوارہ تو یہاں ہوگا؟''

''نہیں'' وہ آدمی پھر مسکرا کر بولا ''واہیگو رو یا اونکار تو ہیں مگر گوردوارہ نہیں ہے۔''

''مگر شریمان'' رام لبھایا جو پہلے سے ہی آگے آ گیا تھا، بے صبری سے بولا ''بھگوان، ایشور، وشنو اور شِو تو ہوں گے؟ پاربتی، درگا اور لکشمی بھی ہوں گی۔ ہندوؤں کے پوجا استھان اور مندر تو ہوں گے؟''

وہ آدمی چہرے کا رنگ بدل کر قدرے سنجیدگی سے بولا۔

''بھگوان، ایشور، وشنو اور شِو تو ہیں لیکن کوئی مندر نہیں ہے۔ یہ جتنے نام آپ تینوں نے لئے، دراصل ایک ہی لاثانی اور لافانی قوت کے مختلف نام یا مظاہر ہیں۔ گاڈ، خدا، اللہ، بھگوان، ایشور، اونکار وغیرہ ایک ہی خالق کے وہ نام ہیں جو آپ نے اپنے اپنے مذہب اور عقیدے اور اپنی اپنی زبان میں خود رکھ لیے ہیں۔''

تینوں چپ سے ہو گئے اور کچھ سوچنے لگے۔ ان میں سے کچھ باتیں تو انہوں نے اپنی دھرتی پر بھی سنی تھیں مگر ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکال دی تھیں اور اپنے اپنے راستوں پر چلتے رہے تھے۔ اوپر سے دکھاوے کی دوستی تھی مگر دل میں دشمنی تھی۔ جب وہ اپنی

سوچ میں الجھ رہے تھے تو ایک عجیب بات ہوئی۔ ڈیوڈ پادری نے ان بزرگ کی طرف دیکھا تو وہ کسی گرجے کے پادری نظر آئے اور ان کے گلے میں ایک چھوٹی سی صلیب بھی لٹکی ہوئی تھی۔ گورودیو سنگھ کی نظر اُن پر پڑی تو وہ ایک سکھ گیانی نظر آئے اور ان کے سر کے پٹکے اور پگڑی پر نشان صاحب سے ظاہر ہوتا تھا کہ کسی گوردوارے کے گرنتھی ہیں۔ مگر رام لبھایا کو وہ کوئی سنت مہاتما نظر آئے کیونکہ انہوں نے گیروے رنگ کے کپڑے پہنے ہوئے تھے، ماتھے پر چندن کا تلک تھا اور گلے میں جنیؤ اور ہاتھ میں مالا تھی۔

''بابا آپ اصل میں ہیں کون؟'' ڈیوڈ پادری تقریباً چلّا کر بولا ''آپ اچانک ایک عیسائی پادری بن کر میرے سامنے کھڑے ہو گئے ہیں۔''

''اور آپ مجھے ایک سکھ سنت نظر آ رہے ہیں۔ وہ آپ کا پٹکا اور پگڑی پر نشان صاحب؟'' گورودیو سنگھ بھی چلّایا۔

''کمال ہے'' رام لبھایا بولا ''مجھے آپ ایک ہندو مہاتما لگ رہے ہیں۔ سچ بتانا کون ہو آپ اور یہ کونسی نگری ہے؟''

وہ آدمی ایک بے آواز ہنسی ہنسا اور تینوں پر ایک نظر دوڑاتا ہوا بولا۔

''تم جس نظر سے مجھے دیکھو گے وہی بن جاؤں گا۔ لیکن میں تو گاڈ، خدایا بھگوان کا ایک ادنیٰ خدمت گزار ہوں اور آپ تینوں کو یہاں سے لے جانے آیا ہوں۔ یہ دھرتی وہی ہے جہاں موت کے بعد سب کو آنا ہوتا ہے۔ ایک بات اور تمہیں بتا دوں کہ ہمارا کوئی مستقل جسم یا شکل نہیں ہوتی۔ ضرورت اور کام کے مطابق ہم اُسی شکل اور جسم میں ڈھل جاتے ہیں۔''

''یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟'' پادری ڈیوڈ اور گورودیو سنگھ تقریباً ایک ساتھ بولے ''گاڈ، خدا اور اونکار تو بلا شرکت غیرے ہوتا ہے۔ وہی سب کچھ ہوتا ہے۔ آپ کا مطلب ہے اس کے بھی نوکر چاکر اور خدمت گار ہیں؟''

''وہ تو ایک ہی ہے مگر کسی بھی نظام میں مددگار اور کارندے تو ہوتے ہیں جنہیں وہ خود پیدا کرتا اور فنا کرتا ہے۔ تمہاری زمین جہاں سے تم آئے ہو اور دوسرے سیارے، سورج اور چاند، خلا اور پاتال یہ سب اس کے کارندے ہی تو ہیں۔ شکل اور جسامت تو ان کی جیسا

کہ میں نے کہا اس کام کے مطابق ہوتی ہے جو انہیں سونپا گیا ہے۔''

پادری ڈیوڈ یہ سن کر ایک لمبی سوچ میں غوطہ لگا گیا۔ اس کی تمام زندگی عیسائی مذہب کی تبلیغ میں گزری تھی۔ اس نے اداسی اور سنجیدگی کے ملے جلے جذبے سے کہا۔

''میرے بزرگوار آپ مجھے لینے آئے ہیں۔ کہاں اور کس کے سامنے لے جائیں گے؟ کیا حشر ہوگا ہمارا اور ہم کون سی شکل اختیار کریں گے۔ اِس کے بارے میں ہم آپ کی باتیں سننے کے بعد مکمل اندھیرے میں ہیں۔ آپ سے پھر ملاقات ہوگی یا نہیں، اس بارے میں بھی شکوک ابھر آئے ہیں۔ گاڈ کے واسطے ہمیں لے جانے سے پہلے ہمارے کچھ شکوک رفع کیجیے۔''

''پوچھیے کیا پوچھنا ہے'' وہ آدمی بولا ''مگر جلدی کیجیے۔''

''دیکھیے جناب'' ڈیوڈ پادری بولا ''میں عیسائی مذہب سے تعلق رکھتا ہوں۔ ہماری دنیا میں عیسائی مت بہت قدیم ہے اور میرا خیال ہے دنیا میں سب سے زیادہ آبادی عیسائیوں کی ہی ہے۔ مجھے آپ گاڈ یا اس کے بیٹے یسوع مسیح کے پاس لے جائیے۔ میں چرچ کے بغیر اپنی اس نئی زندگی کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔''

''کچھ اسی نوعیت کا سوال میرا ہے'' گورودیو سنگھ بولا ''مجھے آپ اونکار یا واہیگورو کے دربار میں لے جائیے اور میری یہاں سب سے بڑے گوردوارے تک رہنمائی کریں تاکہ میں وہاں پڑا رہوں اور شبد کیرتن میں دل لگاؤں اور بھگوان کی سیوا کروں۔''

''اور مجھ جیسے ہندو کا کیا ہوگا؟'' رام لبھایا بولا ''بھگوان کے درشن کرا دیجیے۔ دوسرے دیوی دیوتاؤں سے ملوا دیجیے اور مجھے کسی ایسی نگری میں چھوڑ دیجیے جہاں مندر ہی مندر ہوں۔ اپنی دنیا میں تو اپنے دھرم کا پالن نہ کر سکا، نہ کوئی پوجا پاٹھ کی مگر بھگوان کی نگری میں تو اپنی اِچھا پوری کر سکتا ہوں۔ یہ نرک ہے یا سورگ۔ مجھے نرک میں نہ ڈلوا دیجیے۔''

اور یہ کہہ کر رام لبھایا نے اس آدمی کے آگے ہاتھ جوڑ دیئے۔ وہ آدمی ایک ایسی ہنسی ہنسا جس کے کئی رنگ تھے۔ پھر بولا۔

''میں آپ لوگوں کے سوالات کے جواب دینے بلکہ شکوک کو رفع کرنے کی کوشش کروں گا۔ سنیئے گاڈ، خدا، ایشور یا اونکار کی اس نگری میں نہ گرجے ہیں۔ نہ مسجدیں،

نہ گوردوارے، نہ مندر اور نہ کوئی دوسرے عبادت خانے۔ ہماری یہ دھرتی تو آپ کی زمین سے سینکڑوں گنا زیادہ بڑی ہے مگر یہاں امن، سکون اور شانتی کا بسیرا ہے۔ سورگ اور نرک انسانی دماغ کی اپج ہیں عین اسی طرح جیسے تم نے خالق اور رب کے اپنے اپنے مذہب اور عقیدے کے مطابق بہت سارے نام رکھ لیے ہیں اور اُسے اپنے اور صرف اپنے مذہب سے جوڑ لیا ہے۔ یہ ساری نگری ہی عبادت گھر ہے مگر سب کا۔ تم دنیا والوں نے تو اپنی دنیا کو ملکوں، مذہبوں اور زبانوں میں بانٹ لیا ہے اور اپنی اپنی ضرورت کی عبادت گاہیں بنالی ہیں۔ تمہاری دھرتی پر مذہب کے اختلاف کی بنا پر کتنی جنگیں، کتنا خون خرابہ ہوا۔ کتنی نفرت اور خود غرضی تم لوگوں نے اپنی خوبصورت دھرتی پر پھیلا دی حالانکہ تم سب اسی ایک خالق کی تخلیق ہو اور وہ دھرتی اسی کی عطا کردہ ہے۔''

''فادر'' ڈیوڈ پادری بولا ''اور میں آپ کو ایسے مخاطب کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔ مجھے آپ کی بات کچھ کچھ سمجھ میں آرہی ہے مگر ذہن ابھی تک صاف نہیں ہوا۔ ازراہِ کرم مجھے بتائیے کہ ہماری زمین پر کروڑہا مسلمان سینکڑوں برس سے اپنے اللہ کی عبادت کرتے آئے ہیں، مسجدوں میں نمازیں پڑھتے آئے ہیں، عیسائی مذہب کے لوگ اگر سینکڑوں برس سے بائبل پڑھتے اور گرجوں میں جاتے آئے ہیں اور ہندو، سکھ اور دوسرے بہت سے دھرموں کے لوگ اپنی عبادت گاہوں میں اپنے طریقے سے جبیں سائی کرتے آئے ہیں تو وہ کیا جھک مارتے آئے ہیں یا بے وقوف بنتے آئے ہیں؟''

''نہیں ہرگز نہیں اور پادری ڈیوڈ تم نے جو کچھ کہا'' وہ آدمی بڑے اطمینان سے بولا ''اسی میں تمہارے سوالوں کا جواب بھی پوشیدہ ہے۔ مگر مجھے پہلے پہلی بات صاف کرنے دو۔ عبادت سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں ہے۔ یہی نفرت کو مٹاتی ہے اور امن و محبت کا درس دیتی ہے۔ اتنی لمبی چوڑی دنیا میں مختلف مذاہب کا ہونا اور الگ الگ عبادت گاہوں کا بننا بھی کوئی عجیب بات نہیں۔ ایک منزل پر پہنچنے کے کئی راستے ہوتے ہیں۔ مگر عجب ہے تو یہ کہ تم انسانوں نے مذہب کے اختلاف کی بنا پر ایک دوسرے سے نفرت کرنا سیکھ لیا اور ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو گئے۔ اپنے مذہب کو دوسرے سے افضل سمجھنے لگے۔''

''مگر شریمان'' گورو دیو سنگھ بولا ''میری سمجھ میں تو بات ابھی تک نہیں آئی۔ ہم

سکھ اگر اپنے دھرم، اپنے واہیگو رو اور اپنے گورو گرنتھ صاحب کی پرستش کرتے ہیں اور گوردواروں میں جا کر متھا ٹیکتے ہیں تو اس وشواس کے ساتھ کہ مرنے کے بعد ہم واہیگو رو یعنی اونکار کے سامنے پیش ہوں گے اور وہاں وہی دھرم اور گوردوارے ہمیں ملیں گے۔ آپ کہہ رہے ہیں کہ یہاں گوردوارے ہیں ہی نہیں اور نہ کوئی سکھ ہے۔ ایسا لگتا ہے ہم نرک میں آ گئے ہیں مگر نرک اور سورگ کے بارے میں آپ کہہ چکے ہیں کہ یہ ہم انسانوں کے دماغ کی اپج ہیں۔ اب آپ سوچیے ساری عمر اللہ اللہ کرنے والے اور مسجدوں میں نماز پڑھنے والے موت کے بعد اللہ کی بجائے کیا واہیگو رو اور بھگوان کے سامنے پیش ہوں گے؟ یا عیسائیوں کے گاڈ کے سامنے؟ یا پھر کرشن اور رام کے پجاری یعنی ہندو اللہ کا سامنا کریں گے؟ آپ کی باتوں نے دماغ پریشان کر دیا۔"

گورو دیو سنگھ کی بات میں رام لبھایا کی اپنی بات آ گئی تھی، اس لیے وہ چپ رہا۔ ویسے بھی وہ ڈیوڈ کی طرح اور گورو دیو سنگھ کی طرح پڑھا لکھا نہیں تھا اور نکتے سے نکتہ نہیں نکال سکتا تھا مگر ڈیوڈ پادری کے خیالات کی رو تیز ہو گئی تھی۔ اس سے نہ رہا گیا اور اس نے اضافہ کیا۔

"آپ کی باتیں سن کر بڑی الجھن میں پڑ گیا ہوں۔ عیسائی اگر گاڈ اور یسوع مسیح کی پناہ میں نہیں ہوں گے تو ان کا کیا ہوگا۔ فی الحال گناہ اور ثواب کی سزا اور جزا کی بات تو چھوڑیے۔"

وہ آدمی یکا یک کچھ زیادہ لمبا اور زیادہ بوڑھا ہو گیا اور اس کے جسم پر کئی رنگ آئے اور چلے گئے۔ موسم میں بھی اب زیادہ خوشگواری آ گئی تھی اگرچہ ہوا کا کوئی نام و نشان نہیں تھا۔ فضا میں پھیلی ہوئی خوشبو زیادہ لطیف اور زیادہ دل پذیر ہو گئی تھی۔ ان تینوں نے تھکاوٹ کی بجائے راحت کا احساس کیا اور کسی بھوک پیاس کا تو انہیں خیال تک نہیں آیا۔ وہ آدمی اپنے ڈھنگ سے مسکرایا اور بولا۔

"تم دنیا والے واقعی نادان ہو۔ تم سب کہتے تو ہو کہ خدا، پرماتما، گاڈ، اور اونکار ایک ہیں اور مختلف مذاہب ایک ہی منزل پر پہنچنے کے الگ الگ راستے ہیں مگر دل سے یہ بات نہیں مانتے۔ ورنہ منزل پر پہنچ کر تم یہ سوالات نہیں کرتے۔ اگر تم واقعی اس

حقیقت کو قبول کرتے تو تمہاری دنیا میں مذہب کے نام پر اتنا خون خرابہ نہ ہوتا۔ کیا تم ہماری دھرتی کو بھی اپنی زمین جیسا بنانا چاہتے ہو اور یہاں آ کر بھی تم ہندو، مسلمان، سکھ اور عیسائی بن کر رہنا چاہتے ہو اور مسجدیں، مندر، گوردوارے اور گرجے بنانا چاہتے ہو؟ اور تمہاری دنیا میں تو سینکڑوں مذاہب ہیں۔ اگر تمہاری بات مان لی جائے تو اس مقدس دھرتی پر بھی الگ الگ خدا اور الگ الگ بستیاں بن جائیں گی، مذہب کی بنا پر! اور پھر سب کچھ وہی ہوگا جو تمہاری دھرتی پر ہوتا ہے، مار کاٹ اور خون خرابہ۔ افسوس کہ تم لوگ مر کر بھی نہیں سمجھے۔ یہاں اگر کوئی مذہب ہے تو صداقت کا، خدمت کا، لافانی محبت اور اس ایک خالق کی عبادت کا اور اس کی رضا اور احکام کی تعمیل کا۔ اب مجھ سے کوئی سوال نہ کرنا۔ آؤ میرے ساتھ چلو۔''

وہ آدمی مڑا اور خلا میں لٹک سا گیا۔ ہاتھ سے ان تینوں کو اشارہ سا کیا مگر یہ کچھ نہ سمجھے۔ چشم زدن میں یہ تینوں ایک دوسرے سے جڑ گئے اور پھر لٹک سے گئے اور بغیر کسی سرسراہٹ اور آواز کے ایک جسم بنے اڑنے یا تیرنے سے لگے۔ اب اُن کے جسم اور ذہن ہر قسم کے احساس اور سوچ سے آزاد تھے!

مولا کی نگری

م۔م۔راجندر